قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹   شمارہ: ۶
جمادی الاخریٰ: ۱۴۳۷ھ - اپریل: ۲۰۱۶ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی نمبر: 5، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ
انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا
وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر و عبر

ممتاز قادری شہیدؒ کی سزا میں دُہرا معیار کیوں؟	۳	محمد اعجاز مصطفی
تحفظِ خواتین بل اور اس کا تجزیہ	۶	

مقالات و مضامین

قول وعمل کا تضاد اور اسلام	۱۵	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
علماء کرام کی ذمہ داریاں!	۱۹	مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ
دوسالہ دراساتِ دینیہ کورس	۲۳	مولانا عمران عیسیٰ
تحریک پاکستان میں علماء کا کردار!	۲۸	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
درد کا حد سے گزرنا ہے' دوا ہو جانا	۳۵	مولانا نور عالم خلیل امینی (انڈیا)
مناجاتِ انبیاءؑ ....انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقبول دعائیں (قسط:۱)	۴۰	مولانا محمد عمر انور بدخشانی
مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی تاریخی خدمات (قسط:۲)	۴۴	مفتی محمد رضا انصاری

یادِ رفتگاں

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی	۵۱	مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر
عظیم باپ کی عظیم بیٹی کی رحلت (اہلیہ حضرت مفتی احمد الرحمٰنؒ)	۵۵	محمد اعجاز مصطفی
مولانا ہارون الرشید ارشدؒ کی رحلت!	۵۸	ء ء ء
خیر محمدؒ کا باوفا صدیقؒ	۵۹	ء ء ء

دار الافتاء

سؤر کا گوشت پکانا	۶۱	ادارہ

www.banuri.edu.pk

ممتاز قادری شہیدؒ کی سزا میں دُہرا معیار کیوں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہِ الذین اصطفٰی

۲۰۱۱ء کا سال مسلمانوں پر ایسا کڑا گزرا ہے کہ اس وقت کے حالات اور واقعات سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دین دشمنوں، کفار اور شاتم رسول گروہوں نے بیک وقت اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یلغار کردی ہے۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکے بنا کر مسلمانوں کے قلوب واذہان کو چھلنی اور زخمی کیا جارہا تھا، دوسری طرف آئینِ پاکستان میں ناموس رسالتؐ کے تحفظ پر مشتمل شقوں کو تبدیل کرانے پر زور دیا جارہا تھا، جس کی بنا پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام قابل ذکر بڑے شہروں میں جگہ جگہ احتجاج اور مظاہرے ہورہے تھے۔ اس دوران آسیہ نامی ایک عیسائی خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کا ارتکاب کیا، موقع پر موجود لوگوں نے اس قضیہ کو تھانے تک پہنچایا، اس ملعونہ کی گرفتاری ہوئی، معاملہ عدالت تک پہنچا، انکوائریاں ہوئیں، بیانات ہوئے، بیانات پر جرح ہوئی، آسیہ مسیح پر جرم ثابت ہوا، عدالت نے اس کو قانون کے مطابق سزائے موت سنائی۔ ادھر اس وقت صوبہ پنجاب پر مسلط کیا گیا گورنر جس کا نام سلمان تاثیر تھا جو تنخواہ اور مراعات تو پاکستان سے لیتا تھا، لیکن اخبارات کے بقول وہ نوکری مغرب کے ایک خفیہ ادارے کی کرتا تھا، جس نے گورنر پنجاب ہوتے ہوئے اس آسیہ مسیح سے جیل میں جا کر ملاقات کی اور اس کو رہا کرانے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ناموسِ رسالتؐ کے تحفظ پر مشتمل قانون کو ''کالا قانون'' کہا اور اس قانون کے ختم کرانے کی اپنی مذموم کوششوں کو اس نے ''مقدس مشن'' کا نام دے رکھا تھا، اور علی الاعلان گستاخانہ جملے اپنے غلیظ منہ سے نکالے تھے، جن غلیظ جملوں کے سننے کی

تاب نہ لاتے ہوئے اور مغلوب الحال ہوکر ڈیوٹی پر مامور اس کے ایک محافظ جناب ملک ممتاز حسین قادریؒ نے اس کو قتل کر دیا۔ اس لیے کہ کوئی بھی مسلمان چاہے وہ اعمال میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، وہ اپنے کانوں سے اور اپنے سامنے حضور اقدس ﷺ کی توہین وتنقیص اور گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ تو ملک ممتاز حسین قادریؒ تھے، ان کی جگہ کوئی اور مسلمان ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا جو جناب ملک ممتاز حسین قادریؒ نے کیا۔ بہرحال جناب ملک ممتاز حسین قادریؒ کو گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمہ چلا اور ان کو سزائے موت سنا دی گئی۔ یہ مقدمہ سیشن کورٹ، ہائی کورٹ سے ہوتا ہوا سپریم کورٹ تک پہنچا، حتیٰ کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر صاحب نے بھی اس ناموس رسالتؐ کے محافظ کے والدین اور وکلاء کی طرف سے کی گئی اپیل کو مسترد کر دیا اور جناب ملک ممتاز حسین قادریؒ کو سزائے موت دے دی گئی۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کوئی شخص وزیر، مشیر، گورنر، وزیراعلیٰ، وزیراعظم یا صدارت کے منصب پر ہو اور وہ آئین پاکستان کو یا آئین پاکستان کی کسی دفعہ کے بارہ میں کہے کہ میں اس کو نہیں مانتا؟ یا وہ آئینِ پاکستان کی فلاں دفعہ کو ''کالا قانون'' کہے؟ آئینِ پاکستان کا حلف اٹھانے والا اِس کہنے کے باوجود کیا اس منصب پر قائم رہ سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ اب جب سلمان تاثیر نے اپنے حلف اور عہدے کی پاسداری نہ کرتے ہوئے یہ سب باتیں آئین اور ناموس رسالتؐ کے قانون کے بارہ میں کہیں تو اس کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیا گیا؟ جب حکومت نے اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کی اور اس نے مسلسل اس قانون کے ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور ان کوششوں کو ''مقدس مشن'' کا نام دے کر اس پر عمل شروع کر دیا تو قانون کو ہاتھ میں لینے کا مرتکب وہ ہوا نہ کہ ملک ممتاز حسین قادری شہید رحمۃ اللہ علیہ۔

۲:... ٹھیک ہے ملک ممتاز قادری شہیدؒ سے غلبۂ حال کی بنا پر یہ فعل سرزد ہوگیا تو اس کے وکلاء کی یہ بات کیوں نہیں سنی گئی کہ ملک ممتاز قادریؒ کے معاملہ کو صرف ایک آدمی کے قتل کے تناظر میں نہ دیکھا جائے، بلکہ یہ معاملہ ناموس رسالتؐ کے تحفظ کا ہے اور ایسے معاملات میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ایمان والا بھی کچھ سے کچھ کرسکتا ہے، جیسا کہ سابق وفاقی وزیر داخلہ جناب عبدالرحمٰن ملک کا بیان ریکارڈ پر ہے، اس نے کہا تھا کہ: ''اگر ممتاز قادری کی جگہ میں ہوتا اور میرے سامنے میرے نبی ﷺ کے بارہ میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہتا تو میں بھی وہی کرتا جو ملک ممتاز قادری نے کیا۔''

۳:... اگر یہ معاملہ غلبۂ حال اور نبی کریم ﷺ کے عشق ومحبت میں ان سے سرزد ہوبھی گیا تھا تو حکومت کو چاہیے تھا کہ ملک ممتاز حسین قادری شہیدؒ اور مقتول سلمان تاثیر کے ورثا کے درمیان ثالث اور دونوں کے سرپرست ہونے کا کردار ادا کرتی کہ یہ معاملہ چونکہ اُن سے ہوگیا ہے اور ناموس رسالتؐ کے تحفظ کا مسئلہ بھی ہے اور غلطی سلمان تاثیر سے بھی ہوئی تھی، لہٰذا آپ لوگ ملک ممتاز حسین قادریؒ کو

معاف کردیں، یا ان سے دیت کا مطالبہ کرلیں ۔ اس طرح کردار ادا کرنے سے ملک ممتاز حسین قادریؒ کی جان بھی بچ جاتی، سلمان تاثیر کے ورثا بھی خوش ہوجاتے اور اہل پاکستان کے دلوں میں بھی حکومت کا وقار اور مرتبہ بلند ہوجاتا۔

۴:...اگر یہ بھی نہیں کیا گیا تو جب صدرِ مملکت کے پاس ملک ممتاز قادریؒ کے ورثا اور وکلا کی طرف سے اپیل گئی تھی تو انہیں چاہیے تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے ان کی اپیل کو قبول کرلیتے اور انہیں باعزت طور پر رہا کردیتے ۔ کیونکہ یہ اختیار اُن کے پاس ہے اور وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کرسکتے تھے یا اگر ایسا نہیں کرسکتے تھے تو کم از کم ان کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کردیتے ۔ اس سے صدرِ مملکت کی عزت و وقار میں بھی اضافہ ہوتا، مسلمانوں کی دعائیں بھی ملتیں اور ان کی دنیا و آخرت بھی سنور جاتی ۔

۵:...قانون دان، علماء کرام، وکلا حضرات اور پاکستانی عوام اس سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر اعلیٰ عدالتوں میں کتنے لوگوں کے بارہ میں سزائے موت کے فیصلے ہوچکے ہیں، لیکن سالہا سال سے ان کو پھانسی کے پھندے پر نہیں لٹکایا گیا ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ برسوں سے کتنے موہن رسول جیلوں میں ایسے ہیں، جن کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ آچکا ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی ابھی تک پھانسی نہیں دی گئی، اس سے بڑھ کر یہ کہ سلمان تاثیر اور ملک ممتاز حسین قادری شہیدؒ کے اس قضیہ کا سبب بننے والی آسیہ مسیح آج تک زندہ ہے، اپیلوں کے نام پر اس کی سزائے موت کو ابھی تک روکا ہوا ہے، آخر ایسا کیوں؟

اب سننے میں آرہا ہے کہ اس آسیہ مسیح کے آقاؤں نے اس کے لیے اپنے ہاں فلیٹ بھی تیار کرلیا ہے، اس کو شہریت بھی دے دی گئی ہے اور کسی وقت اس کو ملک سے مخفی طور پر رخصت کردیا جائے گا ۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ملک، حکومت اور صاحبانِ اقتدار کے لیے ایک اور کالک ہوگی اور اس سے حکومت، عدلیہ اور برسرِ اقتدار طبقہ کی جو رُسوائی ہوگی، اس کو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔

۶:...ملک ممتاز حسین قادری شہیدؒ نے تو آخری وقت تک کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اپنے گھر والوں سے آخری ملاقات کرتے ہوئے بھی انہوں نے کہا کہ: ''میں جیت گیا تم ہار گئے، میں نہیں کہتا تھا کہ تم صدرِ مملکت کے پاس اپیل لے کر نہ جاؤ ۔'' پھر اپنے بیٹے سے قرآن کریم کی تلاوت سنی، بہادروں کی طرح اخیر وقت میں اذان دی، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کو بلند کرتے ہوئے مسلمانوں کو کامیابی کی طرف دعوت دی اور درود وسلام پڑھتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو گلے لگالیا، اور کہتا ہوا گیا کہ: ''حضور اکرم ﷺ میرا انتظار فرمارہے ہیں، تھوڑی دیر بعد امام الانبیاء، خاتم الانبیاء، سردارِ دوعالم ﷺ سے ملاقات ہوگی ۔''

ملک ممتاز حسین قادری شہیدؒ تو پہلے دن سے ہی اپنا سب کچھ حضور اکرم ﷺ کی عزت وعظمت اور آپ ﷺ کی ناموس کے تحفظ کے لیے قربان کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے، کیونکہ ان کے سامنے یہ شعر تھا کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حکمرانو! تم کس کس کو پھانسی پر لٹکاؤ گے اور کس کس چیز پر پابندیاں لگاؤ گے؟ اور کیا ان پھانسیوں اور پابندیوں سے مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ عشق و وفا کے سپوتوں کی محبت کم کرسکو گے؟ حاشا وکلا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو ملک ممتاز قادری شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نمازِ جنازہ میں چار کلومیٹر پر پھیلا ہوا انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نہ ہوتا۔ ملک ممتاز قادری شہیدؒ کی نمازِ جنازہ سے ان کے بارہ میں غلط فہمی میں مبتلا افراد اور اداروں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔

..........❖..........❖..........❖..........

تحفظ خواتین بل اور اس کا تجزیہ

گزشتہ دنوں ۲۵/فروری ۲۰۱۵ء بروز جمعرات پنجاب اسمبلی نے خواتین کے تحفظ کے نام پر ایک بل پاس کیا، جو اَب صوبہ پنجاب کی سطح تک قانون کا حصہ بن چکا ہے۔ اس بل کی دفعات اور ان کی وضاحت جو اخبارات کے ذریعہ اب تک سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے:

''۱:....تحفظ خواتین بل کی منظوری کے بعد تشدد کا شکار خاتون کو گھر سے بے دخل نہیں کیا جاسکے گا۔ اور اس کے تمام اخراجات مرد اٹھائے گا۔

۲:....خاتون پر تشدد کرنے والے مرد کو۲/دن کے لیے گھر سے نکالا جاسکے گا۔

۳:....عورتوں پر تشدد کرنے والے مردوں کو عدالتی حکم پر ٹریکنگ کڑے لگائے جائیں گے۔

۴:....اور ٹریکنگ سسٹم اتارنے پر مردوں کو سزا دی جائے گی۔

۵:....بل میں خواتین پر گھریلو تشدد، معاشی استحصال، جذباتی، نفسیاتی، بدکلامی اور سائبر کرائمز شامل ہیں۔

۶:....بل میں کہا گیا ہے کہ گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی خواتین کے تحفظ کے لیے شیلٹر ہوم بنائے جائیں گے، جن میں متأثرہ خواتین اور بچوں کو بورڈنگ، لاجنگ کی سہولت فراہم کی جائے گی۔

۷:....خواتین پر تشدد کی شکایات کے ازالہ کے لیے ٹال فری نمبر قائم کیا جائے گا اور خواتین کی شکایات کی تحقیقات کے لیے ڈسٹرکٹ پروٹیکشن کمیٹی بنائی جائے گی، جبکہ مصالحت کے لیے سینٹرز بھی قائم کیے جائیں گے۔

۸:....تشدد زدہ خاتون کو اس کی مرضی کے بغیر گھر سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ دوسری صورت میں وہ اپنے انتظام کردہ متبادل گھر یا شیلٹر ہوم میں رہائش رکھ سکتی ہے۔

۹:....ضلع افسر تحفظِ خواتین متأثرہ خاتون کو بچانے کی غرض سے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ داخل ہوسکے گی، حفاظتی افسر سے مزاحمت کرنے والے کو چھ ماہ قید اور پانچ لاکھ روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوسکیں گی۔

۱۰:....اگر مدعا علیہ عبوری آرڈر پروٹیکشن آرڈر وغیرہ کی حکم عدولی کرے گا تو اسے ایک سال قید یا پچاس ہزار سے دو لاکھ روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوسکیں گی۔ سزا سے متأثرہ شخص تیس دن میں سزا کے خلاف اپیل کرسکے گا۔ حکومت اس قانون کے تحت پروٹیکشن سسٹم کی کارکردگی وقتاً فوقتاً آڈٹ کرائے گی۔ حکومت مالی سال کے اختتام پر تین ماہ کے اندر پروٹیکشن سسٹم کی سالانہ رپورٹ صوبائی اسمبلی میں پیش کرے گی۔'' (روزنامہ جنگ کراچی، جمعرات، ۲۵ر فروری ۲۰۱۶ء)

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمارا ملک پاکستان اسلامی نظریہ کے تحت وجود میں آیا، اس کے آئین میں صراحۃً یہ بات درج ہے کہ: اس ملک میں قرآن وسنت سپریم لاء ہوگا اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ لیکن اس بل کے مندرجات بالا پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بل درحقیقت قرآن وسنت، آئین پاکستان اور مشرقی روایات کے بالکل برعکس اور متصادم ہے۔

اب آیئے! دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے اس بارہ میں کیا راہنمائی فرمائی ہے، سورۃ النساء، آیت نمبر: ۳۴، ۳۵ میں ارشادِ خداوندی ہے:

''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلٰی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِھِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ وَاللَّاتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِیْ الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَکُمْ فَلاَ تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلاً إِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ أَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ أَھْلِھَا إِنْ یُّرِیْدَا إِصْلاَحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا إِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا۔'' (النساء: ۳۴، ۳۵)

ترجمہ: ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر

فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں، مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، پھر وہ اگر تمہاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں اور اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں کشاکش کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی میں اتفاق فرماویں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔'' (ترجمہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ)

اعتقادات ہوں یا عبادات، ان میں مرد اور عورت بحیثیت ایک عبد اور مکلّف مخلوق کے دونوں مساوی وہم مرتبہ ہیں۔ نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور تمام عبادات جس طرح اور جس پیمانہ پر مرد کی قبول ہوسکتی ہیں، وہی ساری راہیں عورت کے لیے بھی کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن دنیاوی معاملات، خاندانی امور کو درست رکھنے اور انتظامی حیثیت میں دونوں مساوی نہیں۔ جیسے باپ اور بیٹا بحیثیت ''عبد'' بالکل ایک ہیں، عنداللہ اعمال کی مقبولیت کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں، لیکن دنیا میں شریعت کا حکم ہے کہ باپ افسر ہوکر رہے اور بیٹا ماتحت ہوکر، باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے۔ اسی طرح معاشرت کی انتظامی ریاست میں مرد کو عورت پر تفوق اور غلبہ حاصل ہے، اور عورت مرد کے ماتحت اور تابع ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ'' فرمایا ہے، یعنی مرد عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے اور ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں۔

عورت اور مرد میں یہ مراتب کا فرق صرف قرآن کریم نے ہی ذکر نہیں کیا، بلکہ گزشتہ سماوی ادیان میں بھی یہ فرق ملحوظ رکھا گیا تھا، چنانچہ بائبل میں لکھا ہے:

''خداوند خدا نے.....عورت سے کہا: اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'' (پیدائش،۳:۱۶)

۲:.....''اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسے خداوند کی، کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسا کہ مسیح کلیسا کا سر ہے اور وہ خود بدن کا بچانے والا ہے، لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے، ایسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کے تابع ہوں۔'' (افسیوں،۵:۲۲)

ویسے بھی اجتماعی زندگی کا اصول یہ ہے کہ اگر چند لوگ مل کر رہنا اور وقت گزارنا چاہتے ہیں تو جب تک ان میں سے ایک کو مطاع، حاکم، منتظم اور سربراہ اور دوسروں کو مطیع، محکوم، تابع اور ماتحت قرار نہیں دیا جائے گا تو کسی طرح بھی اجتماعی زندگی نبھ نہیں سکتی۔ ملکوں کے بادشاہ، صدور، وزرائے اعظم، قبیلوں کے سردار اور اداروں کے سربراہان اسی اصول اور فلسفے کے ماتحت بنائے اور مقرر کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ریاستوں کا انتظام، ملکوں کا نظام، جماعتوں کا نظام، اداروں کا نظام بغیر سربراہ، امیر اور حاکم کے درست نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح گھریلو زندگی بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہوتی ہے، جس میں چند افراد مل کر وقت گزارتے ہیں، جب تک اس میں بھی کسی کو سربراہ اور حاکم مقرر نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک یہ خاندانی انتظام بھی درست نہیں رہ سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ سربراہ کس کو متعین کیا جائے، مرد کو یا عورت کو؟ قرآن کریم نے طے کردیا کہ مرد کو ہی سربراہ اور حاکم بنایا جائے، اور قرآن کریم نے اس کی دو وجوہ بیان کی ہیں:

۱:....ذاتی اور وہبی، ۲:....عرضی اور کسبی

۱:....ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر بہت سی باتوں میں فضیلت دی ہے، من جملہ ان کے عقل، فہم، علم، حلم، حسن تدبر، قوتِ نظریہ، قوتِ عملیہ، اور قوتِ جسمانیہ وغیرہ مردوں کو بنسبت عورتوں کے کہیں زائد عطا کی۔ نبوت، امامت، خلافت، قضاء، شہادت، وجوبِ جہاد، جمعہ، عیدین، اذان، خطبہ، جماعت کی نماز، نکاح کی مالکیت، تعددِ ازواج، طلاق کا اختیار، میراث میں حصہ کی زیادتی، نماز اور روزہ کا پورا کرنا، حیض ونفاس، حمل اور ولادت سے محفوظ رہنا، یہ فضائل اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عطا کیے ہیں۔

چونکہ جسمانی قوت کے اعتبار سے عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، قضا وقدر نے عورتوں کی سرشت میں برودت اور نزاکت رکھی ہے، مردوں میں حرارت اور قوت رکھی ہے، اس وجہ سے فوجی بھرتی، جنگ وجدال، قتال وجہاد، شجاعت وبہادری اور میدانِ جنگ میں حکومت وسلطنت کے لیے جانبازی، سرحدوں کی حفاظت ونگرانی اور حکومت کے استحکام وبقا کے لیے جس قدر اعمالِ شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب مردوں ہی سے سرانجام پاتے ہیں۔ مرد کی ساخت اور بناوٹ ہی اس کی فوقیت اور فضیلت کا ثبوت دے رہی ہے اور عورت کی فطری نزاکت، اس کا حمل اور ولادت اُس کی کمزوری اور لاچاری کی دلیل ہے اور ظاہر ہے کہ کمزور اور ناتواں کو قوی اور توانا پر نہ حکومت کا حق ہے اور نہ وہ کرسکتا ہے۔ اس لیے اس کا اقتضاء یہی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہوں اور عورتیں ان کی محکوم اور تابع ہوں۔

۲:....عرضی اور کسبی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر حاکم اور سربراہ مقرر کیا ہے کہ انہوں نے عورتوں پر مہر کی صورت میں مال خرچ کیا اور ان کے کھانے، پینے، لباس اور مکان کا خرچ اپنے ذمہ لیا۔ مرد اپنے سے زیادہ ان کی راحت رسانی کا خیال رکھتا ہے، اس لحاظ سے بھی مرد عورتوں کے محسن

ہوئے اور محسن کو حکومت کرنے کا حق ہے، کیونکہ وہ عورتوں کا آقا اور ولی نعمت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دینے والا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور لینے والا ہاتھ نیچے، ان وجوہ کی بنا پر عورتوں کو مردوں کا تابع اور محکوم بنایا۔

اس سوال پر کہ مرد کو حاکم بنایا جائے یا عورت کو؟ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس کے عقلی احتمالات تین ہوسکتے ہیں :

۱:.... مرد حاکم اور عورت محکوم ہو، ۲:.... عورت حاکم اور مرد محکوم ہو، ۳:.... مرد اور عورت دونوں مساوی اور برابر ہوں۔

قرآن کریم اور شریعت اسلامیہ نے پہلے احتمال کو اختیار کیا، یعنی مرد حاکم ہو اور عورت کو اس کا محکوم قرار دیا اور اس پر یہ حکم دیا کہ چونکہ مرد حاکم اور بالا دست ہے، اس لیے عورت کے تمام مصارف کی ذمہ داری مرد پر ہے اور مرد ہی پر مہر واجب ہے۔

اگر دوسرا احتمال لیں اور عورتیں یہ چاہیں کہ ہم حاکم بنیں اور مرد ہمارے محکوم بنیں تو پھر عورتوں کو چاہیے کہ مرد کے تمام مصارف کی کفیل اور ذمہ دار وہ خود بنیں اور عورتوں پر ہی مردوں کا مہر واجب ہو اور نکاح کے بعد اولاد کے مصارف، ان کی خورد ونوش، تعلیم وتربیت کے اخراجات کی وہ کفیل ہوں، حتیٰ کہ مکان کا کرایہ بھی عورتوں کے ذمہ ہو، جس طرح مرد حاکم ہونے کی صورت میں ان تمام مصارف کو برداشت کرتا ہے۔

اور اگر عورتیں تیسرا احتمال اختیار کریں کہ مرد اور عورت دونوں برابر ہوں، نہ کوئی حاکم ہو اور نہ کوئی محکوم، تو پھر اس کا تقاضا یہ ہے کہ مہر تو پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہوجائے گا اور پھر نان، نفقہ، لباس اور رہائش کا مسئلہ بھی ختم ہوگا۔ اس لیے کہ برابری کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک اپنا اپنا ذمہ دار رہے اور خانگی مصارفِ خورد ونوش، بچوں کی تعلیم وتربیت کے مصارف آدھے مرد پر اور آدھے عورت پر واجب ہوں۔

غرض یہ کہ شریعت نے جو مرد کے حاکم ہونے کا فیصلہ کیا ہے، وہ نہایت ہی عادلانہ اور حکیمانہ فیصلہ ہے اور عورتوں کے حق میں اس سے زیادہ نافع اور مفید کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ عورتوں پر اس فیصلہ کا شکر واجب ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے ضعف اور کمزوری اور وسائلِ معاش سے لاچاری اور مجبوری کی بنا پر اس کو شوہر کا محکوم بنا کر پیکرِ محبوبیت ونزاکت بنایا کہ عورت مرد پر ناز کرے اور تمام مصارف اور ذمہ داریوں سے سبکدوش رہے۔

قرآن کریم نے مہذب، شریف، شائستہ، نیک، اور فرمانبردار بیویوں کی علامت یہ بتلائی ہے کہ وہ شوہر کی غیرموجودگی میں اس کی عزت وناموس اور اس کے مال وجائداد کی نگہداشت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بالمقابل غیر مہذب، ناشائستہ سلوک اور نافرمانی کرنے والی عورتوں کو سمجھانے کے لیے قرآن کریم نے تین طریقے اور درجے بتلائے ہیں :

ا:....ان کو وعظ ونصیحت، ہمدردی وخیرخواہی اور نفع ونقصان بتلا کر سمجھایا جائے۔ اگر بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اپنی روش اور رویہ تبدیل کرلیں تو ٹھیک ہے، ورنہ دوسرے درجہ پر ان کے بستر تنہا کردو۔ اس سے وہ اپنے آپ کو درست اور ٹھیک کرلیں تو صحیح ہے، ورنہ تیسرے درجہ پر ان کو مار پیٹ کے ذریعہ تنبیہ کرو اور مار پیٹ ایسی ہو کہ اس سے زخم نہ آئے اور نہ ہی منہ پر مارا جائے، اگر وہ فرمانبرداری اور اطاعت شروع کردیں تو ان پر تنگی نہ کرو، اور اگر اس سے بھی معاملہ نہ سنبھل سکے تو پھر دو منصف دونوں طرف سے اس معاملہ کو سلجھائیں۔

بہرحال یہ قرآن کریم کی ہدایات ہیں، جن سے گھریلو زندگی کو خوش اسلوبی سے چلایا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم کا یہ خطاب رومی وجاپانی، اعلیٰ وادنیٰ، شریف ورذیل، عالم وجاہل، دیہاتی اور شہری، نیک بخت اور بدباطن، ہر طبقہ، ہر سطح اور ہر ذہنیت کے لوگوں کے لیے ہے، پہلی صدی سے لے کر قیامت تک ہر زمانہ اور ہر دور والوں کے لیے ہے، اور اس کے احکام ومسائل میں ہر انسانی ضرورت اور ہر بشر کے ماحول کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں جہاں عورت کے لیے جسمانی سزائیں عام ہیں، علاج کی یہ صورت ظاہر ہے کہ انہی طبقوں کے لیے ہے۔ پھر اتنی اجازت بھی ضرورت پڑنے پر ہی ہے، ورنہ سیاقِ عبارت نرمی کی سفارش کرتا ہے۔

اب اس تحفظِ خواتین بل کا شق وار جائزہ لیتے ہیں کہ آیا یہ قرآن وسنت، آئین پاکستان اور مشرقی روایات سے کوئی میل اور تعلق رکھتا ہے یا نہیں؟ اس بل کی پہلی شق ہے کہ:

ا:-''تحفظِ خواتین بل کی منظوری کے بعد تشدد کا شکار خاتون کو گھر سے بے دخل نہیں کیا جاسکے گا۔ اور اس کے تمام اخراجات مرد اٹھائے گا۔'' ا:....اس شق میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ تشدد کے اسباب اور جوہات کیا تھیں، بالفرض اگر اس کا سبب عورت کا کوئی گھناؤنا فعل ہو تب بھی مرد ہی مجرم ہوگا؟ ۲:....تشدد کرنے والا کون ہے؟ عورت یا مرد؟ یا اس کی ساس، سسر، دیور یا اس کی نند یا کوئی بیرونی شخص؟ ظاہر ہے وہ عورت تو اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہے گی، اگر اس عورت کے میکے والے زبردستی اس عورت کو اپنے گھر لے گئے تو اس صورت میں بھی شوہر قصوروار ہوگا؟

اور پھر ان اخراجات سے کون سے اخراجات مراد ہیں، اگر عورت شوہر کے گھر میں ہے تو ظاہر ہے اخراجات شوہر ہی کے ذمہ ہوں گے اور اگر وہ عورت بغیر شوہر کے تشدد کے شوہر سے روٹھ کر اپنے میکے یا کہیں اور چلی جاتی ہے تو کیا اس صورت میں بھی اس کے اخراجات شوہر دے گا؟ یا اگر عورت نے مرد پر تشدد کیا یا اس کو زدوکوب کیا تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ پھر اگر وہ شوہر پہلے ہی سے روزانہ مزدوری کر کے بڑی مشکل سے گھر کا گزارہ چلا رہا ہے تو اس صورت میں وہ جرمانے کے اخراجات کہاں سے لائے گا؟

۲:-’’خاتون پر تشدد کرنے والے مرد کو ۲/دن کے لیے گھر سے نکالا جاسکے گا۔‘‘
ا:....شوہر کو اس کے گھر سے کون نکالے گا؟ پھر جب شوہر کو گھر سے نکالا جائے گا تو گھر اور بیوی بچوں کے اخراجات کا کون ذمہ دار ہوگا؟ ۲:....گھر تو شوہر کی ملکیت ہے، نہ کہ عورت کی ملکیت یا اگر گھر کرائے کا ہے تو اس کا کرایہ تو شوہر ادا کرتا ہے تو کیا کسی کو اس کی ملکیت یا گھر سے بے دخل کرنا شرعاً، اخلاقاً وقانوناً جائز ہے؟ ۳:....شوہر دو دن باہر کہاں گزارے گا؟ ۴:....جب شوہر دو دن باہر گزار کر گھر آئے گا تو کیا اس عورت کو وہ اپنے نکاح میں رکھے گا؟ ۵:....اگر نہیں رکھے گا اور طلاق دے کر اس کو فارغ کردے گا تو وہ عورت اپنا سر کہاں چھپائے گی؟ ۶:....اس کے روزمرہ کے اخراجات کا کفیل کون ہوگا؟ کیا ایسی عورت پھر بے رواہ روی کا شکار نہ ہوگی؟

۳، ۴:-’’عورتوں پر تشدد کرنے والے مردوں کو عدالتی حکم پر ٹریکنگ کڑے لگائے جائیں گے اور ٹریکنگ سسٹم اتارنے پر مردوں کو سزا دی جائے گی۔‘‘ اس شق میں یہ وضاحت نہیں کہ عورتوں پر تشدد کرنے والوں کو جو کڑا پہنایا جائے گا وہ عورت کا شوہر ہے یا کوئی اور؟ ۲:....اگر اس تشدد کا سبب عورت ہو، مثلاً: وہ شوہر کے گھر والوں سے لڑ رہی ہو، یا مرد کی عزت وناموس اور اس کے مال میں خیانت کی مرتکب ہو، تب بھی یہ ٹریکنگ کڑا اس کے شوہر کو پہنایا جائے گا؟ اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ کیا اس لیے کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہ جائے؟ اگر اسے حقوقِ زوجیت کی ضرورت ہو تو پھر بھی وہ اس کے قریب نہیں جاسکے گا؟ اگر ایسا ہے تو کیا شریعت میں اس کی اجازت ہے؟ حالانکہ احادیث میں تو یہ آتا ہے:

ا:-’’وعن أبی هريرةؓ قال:قال رسول اللّٰه ﷺ :إذا دعا الرجل امرأتهٗ إلی فراشهٖ فأبت، فبات غضبان لعنتها الملائكة حتی تصبح۔‘‘(متفق علیہ)’’وفی رواية لهما قال: والذی نفسی بيدهٖ ما من رجل يدعو امرأتهٗ إلی فراشهٖ فتأبٰی عليه إلا كان الذی فی السماء ساخطا عليها حتی يرضی عنها۔‘‘ (متفق علیہ،مشکوٰۃ،ص:۲۸۰)

’’حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے، وہ انکار کرے اور شوہر ناراضی کی حالت میں رات گزارے تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔ اور صحیح بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کوئی آدمی جو اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلاتا ہے اور وہ انکار کرتی ہے تو آسمان والا (یعنی اللہ تعالیٰ) اس پر ناراض رہتا ہے، یہاں تک کہ شوہر اس سے راضی ہوجائے۔‘‘

۲:-’’وعن أبی هريرةؓ قال:قال رسول اللّٰه ﷺ :لو كنت آمر أحدا أن يسجد لأحد لأَمَرْتُ المرأةَ أن تسجد لزوجها۔‘‘ (مشکوٰۃ،ص:۲۸۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو یہ حکم دیتا کہ وہ کسی کے سامنے سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔''

۳-''وعن طلق بن علی رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم :إذا الرجل دعا زوجتہٗ لحاجتہٖ فلتأتہٖ وإن کانت علی التنور۔'' (مشکوٰۃ،ص:۲۸۱)

''حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو اپنی ضرورت کے لیے بلائے تو وہ (فوراً) آجائے، خواہ وہ تنور پر کھڑی (روٹیاں لگا رہی) ہو۔''

کیا اس شق سے یہ تأثر نہیں ملتا کہ قرآن وسنت کے برعکس عورت کو بے حیائی اور بے غیرتی کا کھلا لائسنس دیا جارہا ہے کہ اس کا شوہر تو اس کے قریب نہ آئے اور عورت جہاں چاہے‘ جائے، جس سے چاہے‘ ملے۔ اس بل کے بعد اس پر کوئی پابندی نہیں، اس لیے کہ کوئی اگر اُسے روکے گا تو پھر اُسے کڑا پہنایا جائے گا۔

۵:-''بل میں خواتین پر گھریلو تشدد، معاشی استحصال، جذباتی ،نفسیاتی، بدکلامی اور سائبر کرائمز شامل ہیں۔'' یہ شق بھی بالکل مبہم ہے کہ گھریلو تشدد کے زمرہ میں کون آتا ہے؟ معاشی استحصال، جذباتی ،نفسیاتی، بدکلامی سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ تمام چیزیں عورت کر رہی ہے، تو پھر قانون کس کے خلاف حرکت میں آئے گا؟

۶:-''بل میں کہا گیا ہے کہ گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی خواتین کے تحفظ کے لیے شیلٹر ہوم بنائے جائیں گے، جن میں متأثرہ خواتین اور بچوں کو بورڈنگ، لاجنگ کی سہولت فراہم کی جائے گی۔'' گویا عورتوں کو ان کے شوہروں سے نجات دلاکر شیلٹر ہوم میں انہیں رکھا جائے گا اور پھر وہ آزاد ہوں گی، جو چاہیں کریں یا جہاں چاہیں پھریں، ان کو کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں ہوگا اور پھر یہ وضاحت نہیں جن کو شیلٹر ہوم میں رکھا جائے گا، ان کو شوہروں سے طلاق دلوائی جائے گی یا بغیر طلاق ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا جائے گا؟ پھر یہ کہ قانون تو ابھی بن گیا، لیکن شیلٹر ہوم بعد میں بنائے جائیں گے؟ اور وہ شیلٹر ہوم بھی کیا ہوں گے؟ گویا بے غیرتی اور بے حیائی کے اڈے ہوں گے، جیسا کہ مشہور ہے کہ پہلے سے جو دارالامان بنے ہوئے ہیں، وہاں پہنچنے والی عورت بمشکل محفوظ رہ پاتی ہے، تو کیا ایسے شیلٹر ہوم اور دارالامانوں کی کثرت کردی جائے گی؟

۷:-''خواتین پر تشدد کی شکایات کے ازالہ کے لیے ٹال فری نمبر قائم کیا جائے گا اور خواتین کی شکایات کی تحقیقات کے لیے ڈسٹرکٹ پروٹیکشن کمیٹی بنائی جائے گی، جبکہ مصالحت کے لیے سینٹرز بھی قائم کیے جائیں گے۔'' گویا عورتیں جس وقت چاہیں وہ اپنے شوہروں کو پولیس کے

حوالے کرنے کے لیے فون نمبر لگا کر اُن کو حوالۂ پولیس کرا سکتی ہیں؟

۸، ۹: -’’تشدد زدہ خاتون کو اس کی مرضی کے بغیر گھر سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ دوسری صورت میں وہ اپنے انتظام کردہ متبادل گھر یا شیلٹر ہوم میں رہائش رکھ سکتی ہے۔ضلع افسر تحفظ خواتین متأثرہ خاتون کو بچانے کی غرض سے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ داخل ہو سکے گی، حفاظتی افسر سے مزاحمت کرنے والے کو چھ ماہ قید اور پانچ لاکھ روپے تک جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوسکیں گی۔‘‘

گویا خاتون کے فون کرنے کی دیر ہے، یا اس کا کڑا پہنا ہوا شوہر جیسے ہی اپنی بیوی کے پاس جائے گا اور اس کا سگنل متعلقہ افسر کے سامنے آئے گا تو وہ فوراً گھر میں گھس سکتا ہے اور اس کے روکنے پر اس کو مزید جرمانہ یا قید کاٹنا پڑے گی، نعوذ باللّٰہ من ذٰلک۔

۱۰: -’’اگر مدعا علیہ عبوری آرڈر پروٹیکشن آرڈر وغیرہ کی حکم عدولی کرے گا تو اسے ایک سال قید یا پچاس ہزار سے دو لاکھ روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں ہوسکیں گی۔‘‘ گویا مدعیٰ علیہ ہمیشہ جیل جانے کے لیے تیار رہے یا پھر اپنی آنکھیں، اپنے کان اور اپنا منہ بند رکھے، اگر اس نے ایسا نہ کیا تو پھر اس کے لیے جیل تیار ہے۔

یہ ہے تحفظ خواتین کا بل، جس کے بارہ میں کہا گیا کہ اس سے عورتوں کا تحفظ ہوگا، حالانکہ ایک سنجیدہ اور باشعور آدمی اسے پڑھتے ہی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ خواتین کے تحفظ کے لیے یہ بل نہیں لایا گیا، بلکہ اس بل سے دین اسلام کے صریح احکامات سے بغاوت کا درس دیا گیا۔مغرب کی گندی تہذیب کی تقلید کی گئی۔اس کے علاوہ ایک پرامن گھریلو نظام کو توڑنے اور بے حیائی و بے شرمی کو سند جواز دینے کے لیے اس بل میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔یوں لگتا ہے کہ اس بل کا ہدف خاندانی نظام کو درہم برہم کرنا، عورت کو تحفظ کے نام پر خاندان کے تحفظ سے نکال کر بے راہ روی کی راہ پر دھکیلنا، آزادی کے نام پر اسے عفت وحیا اور پاکدامنی سے آزاد کرکے کاروباری جنس بنانا، برابری کے نام پر اس پر وہ بوجھ ڈالنا ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا ہی نہیں کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری قوم کے ایمان، حیا، عفت، غیرت اور پاک دامنی کی حفاظت فرمائیں، ان کے گھریلو نظام زندگی کو ٹوٹنے سے محفوظ فرمائیں اور ہمارے حکمرانوں کو ایمانی غیرت اور عقل سلیم عطا فرمائیں۔

وصلّٰی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

قول وعمل کا تضاد اور اسلام

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

آسمانی وحی میں جن بڑے بڑے جرائم کو حق تعالیٰ کے شدید غضب و ناراضی کا سبب قرار دیا گیا ہے ان میں سے قول وعمل کے تضاد کو بھی ذکر فرمایا گیا ہے، قرآن کریم میں سورۂ صف میں ارشاد ہے:

''یٰٓا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔'' (الصف:۲،۳)

''اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، خدا کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔''

درحقیقت نفاق بھی یہی چیز ہے کہ زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ ہے، منافقوں کے لیے سزا اور وعید بھی قرآن کریم میں شدید آئی ہے:

''إِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِیْ الدَّرْکِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔'' (النساء:۱۴۵)

''بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں جائیں گے۔''

نفاق کی تین صورتیں

اسلام کی اصطلاح میں الحاد اور زندیقیت کا بھی یہی مفہوم ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے زندیق اسی کو بتایا ہے جو زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور دل میں کفر چھپائے، گویا قول وعمل کے تضاد کا نام نفاق ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں: اول یہ کہ قلبی اعتماد تو صحیح ہو مگر عمل دعویٰ کے خلاف ہو، یہ نفاق فی العمل ہے۔ دوم یہ کہ دل سے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر سرے سے اعتقاد ہی نہ ہو، بلکہ صرف ظاہرداری کے لیے ایمان و اسلام کے زبانی دعوے کیے جائیں، یہ نفاق اعتقادی کہلاتا ہے جو کفر خالص ہے اور اس کے لیے دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ کی وعید ہے۔ سوم یہ کہ ایک شخص دل میں عقیدۂ کفر رکھتا ہے، مگر ظاہری طور پر اسلام کا انکار نہ کرے، بلکہ بظاہر اسلام کا اقرار کرے اور قرآن وحدیث کی نصوص میں تاویل وتحریف کر کے انہیں اپنے عقائد باطلہ پر چسپاں کرے، یہ زندقہ اور الحاد کہلاتا ہے جو نفاق فی

التعبیر سے پیدا ہوا اور نفاق کا یہ درجہ سب سے اشد ہے، چنانچہ منافق کی توبہ بالاتفاق مقبول ہے، لیکن زندیق کی توبہ بعض علماء کے نزدیک لائق التفات نہیں۔ ان تین مراتبِ نفاق میں فرق یہ ہے کہ نفاقِ عملی کی صورت میں ایمان و اعتقاد باقی ہے اور عمل کے بہت شعبے بھی موجود ہیں، مگر کسی خاص شعبۂ عمل میں نفاق ہے اور نفاقِ اعتقادی میں نہ ایمان ہے نہ اسلام، نہ عقیدہ ہے، نہ عمل صرف ظاہر داری کے لیے دعویٰ ہی دعویٰ ہے، یعنی خالص کفر کے باوجود اسلام کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور تیسرا مرتبہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اس میں نفاق اعتقادی کے ساتھ نصوص میں تحریف کا اضافہ ہوجاتا ہے، گویا خالص کفر کو تاویلات کے ذریعے اسلام ثابت کیا جاتا ہے، الغرض قول وعمل کا تضاد ہو یا نفاق ہو حق تعالیٰ کے نزدیک بدترین جرم ہے، شدید غضبِ الٰہی کا سبب ہے۔

آج مسلمانوں کا بظاہر عام جرم یہی ہے کہ زبان سے اسلام کا دعویٰ ہے، لیکن عمل وہ ہیں جن سے کافر بھی شرمائے اور افراد و اشخاص ہوں یا حکومتیں، راعی ہوں یا رعایا سب آج اس عظیم معصیت میں مبتلا ہیں، نفاق عملی میں تو قریباً سبھی مبتلا ہیں کہ زبان سے دعوے کچھ کیے جاتے ہیں اور عمل کچھ اور ہوتا ہے، لیکن بہت سے لوگ تو واقعۃً نفاقِ اعتقادی کے مریض ہیں، یعنی وہ مسلمان صرف اس لیے کہلاتے ہیں کہ ان کو مسلمانوں سے واسطہ ہے، ورنہ ان کے دل میں اسلام نہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی عظمت ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا اعتقاد ہے، اور بہت سے لوگ اسلام کی پیمائش نفس وشکم کے پیمانے سے کرتے ہیں، گویا انسان کو دینِ اسلام کی اطاعت وفرمانبرداری کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ خود اسلام کو انسانی خواہشات کے پیچھے چلنے کے لیے نازل کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں پر یہ فرض عائد نہیں کرتے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے ڈھانچے میں ڈھالیں، بلکہ وہ اسلام پر یہ فرض عائد کرتے ہیں کہ وہ انسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھلتا رہے، یہ موجودہ دور میں زندقہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج عمومی طور پر مسلمان نفاقِ عملی یا اعتقادی میں مبتلا ہے، آج ہمیں جو ذلت ونکبت نصیب ہورہی ہے، درحقیقت اس منافقانہ طرزِ زندگی کی سزا ہے۔

پاکستان کیوں حاصل کیا گیا اور اَب تک کیا ہوا؟

ماضی قریب میں متحدہ ہندوستان میں ہم نے یہی نعرے لگائے کہ مسلمانوں کے لیے ایک مستقل جداگانہ سرزمین کی اس لیے ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے نفاذ کے لیے اسلام کی حکومت قائم ہو اور سر سے پیر تک اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہو، اس موقع پر ہم نے بڑے بلند بانگ دعوے کیے تھے کہ حق تعالیٰ کے قوانینِ عدل کا اجرا ہوگا، اسلامی شعائر کا احیاء ہوگا، اسلامی اتحاد کا خواب پورا ہوگا، اسی مقصد کے لیے جلسے کیے، جلوس نکالے، کوششیں کیں، قراردادیں پاس کیں، جان ومال اور عزت وآبرو کی قربانیاں دیں، جو کچھ ہوا اور جو کچھ کیا اس کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، بہرحال جد وجہد ٹھکانے لگی،

حق تعالیٰ نے غلامی کے طویل دور کے بعد آزادی کی نعمت نصیب فرمائی اور ایک بڑی عظیم سلطنت عطا فرمائی۔ ۱۲؍کروڑ کی قابل قدر، اطاعت شعار، فرمانبردار رعیت عطا فرمائی جس نے کارخانے بنائے، کاروبار کو ترقی دی، مملکت کو آباد کیا، اس کو چار چاند لگائے، باہر کی دنیا میں اس کا وقار قائم کیا، مسجدیں بنائیں، مدرسے تعمیر کرائے اور اتنا کمایا کہ اپنے ٹیکسوں سے حکومت کے خزانوں کو معمور کیا اور قوم کی محنتوں سے ملک کہاں سے کہاں پہنچا، ماضی وحال کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، غرض دین و دنیا کی سعادتوں سے مملکت کو ہم کنار بنایا، لیکن جس بنیادی مقصد کا بار بار اعلان کیا جاتا تھا کہ اسلامی حکومت قائم ہوگی اور یوں عالمِ اسلام سے اتحاد ہوگا، اس کے لیے حکمرانوں اور حکومتوں نے کیا کیا؟ اپنے وعدوں کو کہاں تک پورا کیا؟ یہاں کون کون سے اسلامی قوانین جاری ہوئے؟ کفر والحاد کو کہاں تک ختم کیا گیا؟ اسلامی معاشرت قائم کرنے کے لیے کیا کیا اقدام کیے گئے؟ ان تمام سوالات کا جواب حسرت ناک نفی میں ملے گا، آخر امتحان کا یہ عبوری دور تھا، کون سی نعمت تھی جو حق تعالیٰ نے نہ دی ہو؟ کون سی فرصت تھی جو نہ ملی ہو؟ لیکن واحسرتاہ! کہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا، مگر پاکستان کے مقصدِ وجود کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، کون سا وعدہ پورا کیا گیا؟ کون سی اسلامی عدالت قائم ہوئی؟ زانی اور شرابی کو کون سی سزا دی گئی؟ بداخلاقی کا کیا انسداد کیا گیا؟ ظلم، عدوان، رشوت ستانی، کنبہ پروری، بے حیائی وعریانی، سودخوری وبدمعاشی کو ختم کرنے کے لیے کون سا قدم اٹھایا گیا؟ بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ سودخوری، شراب نوشی، بداخلاقی اور بے حیائی کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی گئی، بلکہ سرکاری ذرائع سے اس کی نشر واشاعت میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی گئی۔ ''بینات'' کے صفحات میں ان دردناک داستانوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

فسق وفجور اور گناہوں کے اثرات

آخر اس فسق وفجور کی کثرت اور خدا فراموش زندگی کی لعنت سے دشمنانِ اسلام (ہندوستان، امریکہ، روس) کے گٹھ جوڑ سے ایک جھٹکا لگا، اور اس بے نظیر مملکت کا ایک حصہ کاٹ دیا گیا اور بقیہ حصہ کو شر وفساد، اختلاف وانتشار، ہوشربا گرانی اور قحط میں مبتلا کر دیا گیا، امن وامان ختم ہوگیا، کسی کی نہ جان محفوظ نہ کسی کا مال محفوظ، نہ کسی کی آبرو محفوظ، بڑی بڑی صنعتیں نیشنلائز کی گئیں مگر نتیجہ صفر، زمینداروں اور کسانوں کے درمیان باہم دست وگریباں کی فضا پیدا ہوگئی، مزدوروں اور کارخانہ داروں کے درمیان بے اعتمادی کی لہر دوڑ گئی، حکمرانوں کی عزت واحترام کا جذبہ رعایا کے دلوں سے نکل گیا، آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کس لیے ہوا؟

جواب صاف اور واضح ہے کہ ہم نے نفاق سے کام لیا، اسلام سے روگردانی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے وفائی کی، خدا تعالیٰ کو دھوکا دیا، قول وعمل کے تضاد کو شعار بنایا اور منافقانہ زندگی کو اختیار کیا:

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

آخر حق تعالیٰ کے قانونِ عدل کا ظہور شروع ہوگیا، قرآن کریم بار بار حق تعالیٰ کے اس قانونِ عدل کا صاف اعلان کرتا ہے کہ جب حق تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی جائے اور قانونِ خداوندی کی توہین کی جائے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں ان سے چھین لی جاتی ہیں اور ان کے بدلے میں عذابِ شدید اس قوم پر مسلط کردیا جاتا ہے، ارشاد ہے:

''لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔'' (ابراھیم:۷)

''اگر شکر کروگے تو تمہیں زیادہ انعام دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا أُوْتُوْا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَاهُمْ مُّبْلِسُوْنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔'' (الانعام:۴۴، ۴۵)

''پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھول گئے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو اُن کو ملی تھیں خوب اترا گئے تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا۔ پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے۔''

نیز ارشاد ہے:

''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔'' (النحل:۱۱۲)

''اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ بڑے امن واطمینان میں تھے، ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں سوانہوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔''

کیا یہ ارشادات ہماری تنبیہ اور گوشمالی کے لیے کافی نہیں؟ کیا دن بدن ہمارا قدم نحوست وادبار کی طرف نہیں بڑھ رہا؟ کیا ہم نے خدا کی متواتر نعمتوں کی ناشکری میں کوئی کسر چھوڑی ہے؟ کہاں گئی وہ قرار دادِ مقاصد جو شیخ الاسلام حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے پاس ہوئی تھی؟ کہاں ہے وہ تعلیماتی بورڈ جس پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا تھا؟ کہاں ہے وہ اسلامی کونسل جس پر لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ ہورہا ہے؟ کیا یہ سب کچھ نفاق نہیں ہے؟ غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والی کون سی برائی ہے کہ اس کو نہ اپنایا ہو اور نیکی وفلاح وبہبود کا کون سا کام ہے جسے ہم نے نہ ٹھکرایا ہو؟ نہ معلوم کہ غفلت کے پردے کب چھٹیں گے اور بدنصیب قوم کا طالعِ سعید کب طلوع ہوگا؟

علماء کرام کی ذمہ داریاں!

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ

حضرات علماء کرام اپنے اپنے حلقے میں دین کے پیشوا اور قوم کے مقتدا ہیں۔ ان کے اس رفیع منصب کے لحاظ سے ان پر بڑی گرانقدر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس لیے ہم سب کا فرض ہے کہ ان عظیم الشان ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امانت ہمارے سپرد کی گئی ہے، اس کے لیے ہم فکرمند ہوں اور امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر لانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

ا- جو حضرات امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، انہیں اس بات کی حرص ہونی چاہیے کہ ان کے وجود سے علاقے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچے اور لوگوں کا تعلق مساجد کے ساتھ قائم ہو، اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں:

الف:- قرآن کریم، حدیث نبوی اور مسائل فقہیہ کا درس باقاعدگی اور التزام سے دیا جائے اور ان کے لیے مناسب وقت تجویز کیا جائے۔

ب:- جن مساجد میں قرآن کریم کے مکاتب نہیں وہاں قائم کیے جائیں اور جہاں مکاتب قائم ہیں ان کی نگرانی کی جائے، ان کو فعّال بنایا جائے اور ترغیب دے کر بچوں کو وہاں لایا جائے، تاکہ محلے کا ایک بھی بچہ ایسا نہ رہے جو کم از کم ناظرہ قرآن کریم پڑھنے سے محروم ہو۔ اسی طرح لوگوں کو قرآن کریم حفظ کرانے کی ترغیب دلائی جائے۔

ج:- تعلیم بالغان کا بھی اہتمام کیا جائے اور لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کا شوق دلایا جائے، نیز اس مقدس کام کے لیے خود وقت دیا جائے۔

د:- نوجوان طبقہ کو دین سے مانوس کرنے کی سعی کی جائے اور ان کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بھی وقت دیا جائے۔

ہ:- جمعہ کے خطبات کیف ما اتفق نہ ہوں، بلکہ ان کے لیے اہم دینی موضوعات کو ایک خاص ترتیب سے منتخب کیا جائے اور جس موضوع پر خطاب کرنا ہو اس کے لیے پوری تیاری کی

جائے، نیز مؤثر انداز میں موضوع کا حق ادا کیا جائے۔ خطابت میں ترغیبی پہلو کو غالب رکھا جائے اور بات ایسے جچے تلے انداز میں کی جائے جس سے نہ صرف بات ذہن نشین ہو جائے، بلکہ سامعین کی فکری وعملی اصلاح بھی ہو۔

و:- جن مساجد میں تبلیغی جماعت کے حلقے قائم ہیں ان سے ربط وتعلق رکھا جائے، ان کی بھرپور اعانت وسرپرستی کی جائے اور نوجوانوں کو ترغیب دے کر تبلیغی جماعت سے وابستہ کرنے کی ہرممکن سعی کی جائے۔

ز:- جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ فِرَقِ باطلہ اور قدیم وجدید ملحدانہ نظریات میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے، ہم اس کو شدت کے ساتھ محسوس بھی کرتے ہیں، لیکن یا تو اس کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں کرتے یا ان کا رد ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ بجائے لوگوں کے ذہن کو صاف کرنے کے انہیں متنفر کردیتے ہیں۔ اس لیے بڑی ضرورت ہے کہ تمام فِرَقِ باطلہ (مثلاً قادیانیت، رفض، انکارِ حدیث، انکارِ عظمت صحابہؓ، کیپٹل ازم، کمیونزم اور لادینیت وغیرہ) پر گہری نظر رکھی جائے، ان پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور مثبت انداز میں قوم کے ذہن کی تعمیر کی جائے۔ تقریر میں کسی خاص فرقے یا نظریئے کا نام لیے بغیر وقتاً فوقتاً باطل نظریات کی اصلاح کی جاتی رہے، مثلاً انکارِ حدیث کے فتنہ کی اصلاح مقصود ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ طیبات کی عظمت اس طرح اجاگر کی جائے کہ منکرین حدیث کا سحر ٹوٹ جائے۔ رفض وتشیع کی تردید منظور ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب والہانہ انداز میں بیان کیے جائیں۔ قادیانیت کی تردید مقصود ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے تقاضے ذہن نشین کرائے جائیں اور استخفافِ ائمۂ دین کی اصلاح مقصود ہو تو حضرات ائمۂ اجتہاد کی ہستیوں اور ان کے احسانات کا مؤثر انداز میں تذکرہ کیا جائے، وعلیٰ ہذا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انفرادی ونجی محفلوں میں بھی فِرَقِ باطلہ کا رد کیا جاتا رہے۔ خصوصاً اگر کوئی شخص کسی غلط نظریئے سے متأثر ہوتا نظر آئے تو بہت حکمت ودانائی اور نرمی وشفقت سے اس کو صحیح بات کی تلقین کی جائے اور اس کی غلط فہمی کی اصلاح کی جائے۔

ح:- خطبات کے دوران نیز نجی محفلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بزرگانِ دین خصوصاً اپنے اکابر دیوبند کے حالات وواقعات اور ملفوظات وارشادات بیان کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ حکایات وواقعات سے اکابر سے عقیدت پیدا ہوگی اور یہی تمام بدعات اور سارے فتنوں کا تریاق ہے۔

۲- جو حضرات تجارت یا کاروبار کی لائن سے وابستہ ہیں وہ اس کو صرف اپنا ذریعۂ معاش نہ سمجھیں، بلکہ اُسے ذریعۂ تبلیغ اور مرکزِ دعوت تصور کریں اور اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر ہوسکتی ہیں:

الف:- بیع وشراء اور کاروبار سے متعلقہ احکام شرعی کو خوب محفوظ کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔

ب:- جو گاہک دکان پر آئے یا جس شخص سے معاملہ کرنا پڑے، باتوں باتوں میں اس کو

احکام شرعیہ کی یاددہانی کی جاتی رہے۔

ج:- اس امر کی کوشش کی جائے کہ آس پڑوس کے دکانداروں کے ساتھ کچھ دینی باتیں ہوجایا کریں اور اس کے لیے کچھ لمحات تجویز کر لیے جائیں۔

د:- بازار میں حق تعالیٰ سے غفلت چونکہ عام ہوتی ہے، اس لیے وہاں ذکر اللہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، لہٰذا کوشش ہونی چاہیے کہ کوئی ہلکا پھلکا ذکر، تسبیح، درود شریف وغیرہ زبان پر جاری رہے اور اس کی عادت بنالی جائے۔

ہ:- کاروبار میں عام طور سے نمازوں سے غفلت ہوجاتی ہے، اس لیے اس کا ضروری اہتمام کیا جائے کہ اذان ہوتے ہی قریب کی مسجد میں نماز با جماعت ادا ہو۔

و:- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بزرگان دینؒ اور اپنے اکابر رحمۃ اللہ علیہم کے واقعات وحالات کا مطالعہ اور مذاکرہ رکھا جائے۔

۳- جو حضرات جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کو حق تعالیٰ نے دینی دعوت کا ایک اہم اور وسیع میدان عطا فرمایا ہے، وہ اپنے عالمانہ وقار اور مومنانہ کردار کے ذریعے دین کی بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

الف:- آج کل تعلیمی اداروں کا ماحول غیر دینی ہے۔ ہمارے علمائے کرام جب اس غیر دینی ماحول میں قدم رکھتے ہیں تو ماحول کو متأثر کرنے کے بجائے بسا اوقات خود ماحول سے متأثر ہوکر احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں اور وہ ماحول ان کے علمی ودینی افادات سے محروم ہوجاتا ہے۔ ان حضرات کو ماحول سے مرعوب نہیں ہوجانا چاہیے، بلکہ یہ تصور کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انہیں دین کی دولت اور سنت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی عظیم الشان نعمت سے نواز کر اِس بگڑے ہوئے ماحول کے لیے مسیحا بنا کر یہاں بھیجا ہے اور جو دولت ان کے سینے میں حق تعالیٰ نے ودیعت رکھی ہے وہی اس ماحول کے لیے تریاق ہے، اس لیے انہیں خود اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھلنا ہے، بلکہ اس ماحول کو سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کے مطابق ڈھالنا ہے۔

ب:- وہ اپنے رفقاء کار (اساتذہ) کو دین کی ترغیب دیں، اپنی تعلیم گاہ میں دینی شعائر کی سربلندی کے لیے تدابیر سوچیں اور اس کے لیے مناسب انداز میں مشورے دیں۔

ج:- جو طلبہ ان کے ہاں زیر تعلیم ہوں ان میں دینی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کریں، انہیں قرآن وحدیث کی ہدایات سے آگاہ کریں، بزرگان دین کے واقعات سنائیں، انہیں نیکی کی ترغیب دلائیں، اخلاق حسنہ کی تلقین کریں اور دینی فرائض کی پابندی کا شوق دلائیں۔

د:- نوجوان طلبہ کو ''تبلیغی جماعت'' میں وقت دینے کی ترغیب دیں اور انہیں جماعت سے

وابستہ کرنے کی کوشش کریں۔

الغرض حضرات علماء کرام جس شعبہ میں بھی کام کررہے ہوں اپنے آپ کو دین کا مبلغ تصور کریں اور مخلوق کو زیادہ سے زیادہ دینی نفع پہنچانے کا فکر واہتمام کریں۔

۴-دوسروں کی فکر کے ساتھ ساتھ خود اپنی تکمیل کی فکر اور اپنے علم اور جذبۂ عمل کو تازہ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر کی جائیں:

الف:-علمی ترقی کے لیے قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ جاری رہنا چاہیے۔

۱-تفسیر میں بیان القرآن، فوائد عثمانی اور معارف القرآن۔

۲-حدیث میں مشکوٰۃ شریف، ریاض الصالحین، جمع الفوائد، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث اور حیات الصحابہؓ۔

۳-فقہ میں بہشتی زیور، عمدۃ الفقہ، امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔

۴-بزرگوں کے حالات وسوانح میں ''نقشِ حیات''، ''اشرف السوانح''، ''علماء ہند کا شاندار ماضی''، ''ارواحِ ثلاثہ''، تذکرۃ الرشید''، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور اس نوعیت کی دیگر کتابیں۔

ب:-عملی ترقی کے لیے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

ج:-حضرات علماء کرام کا شمار چونکہ خواص امت میں ہوتا ہے اور ان کی ترقی وتنزل سے پوری امت متأثر ہوتی ہے، اس لیے اپنی اصلاح وتربیت کے لیے ہر عالم کا کسی متبع سنت شیخ کامل سے وابستہ ہونا ناگزیر ہے اور حضرات علماء کرام کو اس کا ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔

ماہنامہ ''بینات'' کی خصوصی اشاعتیں

①	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ	=/350 روپے
②	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	=/300 روپے
③	حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید رحمۃ اللہ علیہ	=/350 روپے
④	حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	=/300 روپے
⑤	حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ	=/100 روپے
⑥	حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	=/100 روپے

نوٹ: منی آرڈر بھیجنے والے حضرات ایک اشاعت خاص کے لیے سو روپے ڈاک خرچ بھی ہمراہ روانہ کریں۔

جامعہ علوم اسلامیہ کی مساعی میں ایک خوبصورت اضافہ

دوسالہ دراساتِ دینیہ کورس

مولانا عمران عیسیٰ

بحمد ہٖ تعالیٰ شوال ۱۴۳۶ھ کے تعلیمی سال کے آغاز میں جامعہ میں وفاق المدارس العربیہ کے مقررکردہ دوسالہ دراساتِ دینیہ کورس کا آغاز کیا گیا ہے۔ درج ذیل مضمون اس کورس کی افادیت پر روشنی ڈالنے کے لیے پیش خدمت ہے۔

بعد الحمد والصلاۃ!

نبوی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے امت میں مختلف کمزوریاں پیدا ہوئیں، من جملہ ان کے یہ سوچ بھی کہ آخرت کے مسائل اور وہاں کی پریشانیوں سے نجات کے لیے تو دین ضروری ہے، رہی ہماری دنیا اور اس کے آئے دن کے مسائل، اس کا حل تو دنیاوی اسباب کی کثرت ودستیابی میں ہی مضمر ہے، جبکہ قرآن وحدیث کی نصوص سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسے حصولِ جنت کے لیے دین دار ہونا ضروری ہے، اسی طرح دنیا میں سکون، راحت، برکت، عافیت، آپس کی محبت، ناگہانی آفات سے بچاؤ کے لیے بھی دین کے سوا کوئی سہارا نہیں۔

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تاریخی فتوحات کے دنوں میں جبکہ مسجد نبوی میں مالِ غنیمت کے انبار لگے ہوئے تھے، ان کا یہ ارشاد سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے:

’’إنا کنا أذل الناس فأعزنا اللّٰہ بالإسلام فلو نطلب العز بغیر ما أعزنا اللّٰہ أذلنا اللّٰہ۔‘‘

ترجمہ:......’’ہم تمام لوگوں میں ذلیل ترین تھے، اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ عزت بخشی، اب اگر ہم عزت کو کسی اور چیز میں تلاش کرنے لگیں گے تو اللہ دوبارہ ذلیل کردے گا۔‘‘ (حیاۃ الصحابہؓ)

مسلمانوں کی عمومی زبوں حالی پستی کا ذکر تو ہر مجلس میں مل جاتا ہے، لیکن اس کا حقیقی سبب کیا ہے؟ ایک روایت مشکوٰۃ شریف سے پیش خدمت ہے:

''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں اور بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں۔ میرے بندے جب میری اطاعت وفرمابرداری کرتے ہیں تو ان کے بادشاہوں کے دل میں رعایا کے لیے محبت وشفقت بھر دیتا ہوں (لیکن) جب وہ میرے نافرمان ہوجائیں تو انہی حکام کو ان کے لیے جان کا عذاب بنادیتا ہوں اور پھر وہ ان کو بہت برا عذاب چکھاتے ہیں۔ (ایسے حالات میں) تم اپنا وقت حکمرانوں پر بددعا دینے میں (اور احتجاج کرنے میں) صرف نہ کرو، بلکہ تم دعا اور اِنابت میں اپنے کو مشغول کرو، تاکہ میں (اللہ) تمہارے طرف سے کفایت کروں۔''

اس لیے مسلمان کی موجودہ پستی کا علاج اس کے سوا کوئی نہیں کہ مسلمان دین کی طرف واپس آجائے: ''**لعلھم یرجعون، لعلھم یضرعون، لعلھم یتضرعون**'' کی منشأ یہی ہے۔

مسلمان دین کی طرف واپس کیسے آئے؟

اس کے لیے کم ازکم دو باتوں کی ضرورت ہے:

۱- دین کا صحیح علم جو قرآن وحدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچا۔

۲- دین پر چلنے کی امنگ وجذبہ، جس کو قرآن ایمان سے تعبیر کرتا ہے۔

سائیکل کے دو پہیوں کی طرح ان دو باتوں کے بغیر کوئی معاشرہ اسلام پر قائم نہیں ہوسکتا۔ دوسرے نکتہ کی خاطر امت میں ہر زمانے کے علماء وصلحاء، تذکیر وتزکیہ کی کوشش کرتے رہے اور اب بھی کررہے ہیں، ہمارے زمانے میں اس کی ایک عام مثال تبلیغ ودعوت کی محنت کی صورت میں موجود ہے، کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ناآشنا لوگ ان مساعی کے طفیل دوسروں کی دینی رہنمائی کا ذریعہ بن گئے۔ جہاں تک تعلق صحیح علم کا ہے، اس کے لیے تکوینی طور پر اللہ نے برصغیر میں مدارسِ دینیہ کا جال بچھا دیا جس کی نظیر پیش کرنے سے عالم اسلام عاجز ہے۔

مدارسِ دینیہ میں کیا پڑھایا جاتا ہے؟

ان مدارس کے نصاب تعلیم کی اساس ''درس نظامی'' ہے جو آٹھ سالوں پر محیط ہوتا ہے اور نحو، صرف، معانی وبلاغت، ادب وانشاء، منطق، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، وغیرہ علوم کی تقریباً ۵۰ سے زائد کتب اس نصاب کا حصہ ہیں، اس آٹھ سالہ نصاب سے پہلے طالب علم کو ایک ابتدائی مرحلہ بھی عبور کرنا ہوتا ہے جو یا تو مروجہ عصری نظام تعلیم کے تحت میٹرک کی شکل میں ہو یا مدارس کے ہی شعبہ اعدادیات کے ذریعہ ہو۔

ہر نصاب تعلیم کی طرح درسِ نظامی سے بھی مقصود یہ نہیں کہ اس میں پڑھائی جانے والی کتابیں، متعلقہ علوم کی تمام معلومات سے ایسے روشناس کرادیتی ہیں کہ پھر ان علوم میں مزید کسی

مطالعے کی ضرورت نہ رہے، بلکہ مقصود متعلقہ علوم میں مستحکم وٹھوس ملکہ وصلاحیت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ گویا دینی مدارس کا مقصد قرآن وحدیث کی تعلیمات کے حامل ایسے رجال کار پیدا کرنا ہے جو مسلم معاشرے کو اسلام کے ساتھ جوڑ سکیں اوران کو بے دینی کی زہریلی ہواؤں سے بچا سکیں، گویا مدارس کے علماء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہیں: ''**یحمل هذا العلم من کل خلف عدولهٗ، ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتأویل الجاهلین ۔**'' بحمدہٖ تعالیٰ دینی مدارس اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں اور یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں اسلام کی جو روشنی نظر آتی ہے وہ انہی مدارس کا فیضان ہے۔

دین کا علم برائے بالغان

مذکورہ بالا تفصیل سے موجودہ اور مروجہ ۸/سالہ نصاب کی اہمیت تو واضح ہوگئی، لیکن محنت وتوجہ کا ایک گوشہ ایسا تھا جس کی طرف ہمارے اکابر عرصہ سے سوچتے رہے (اور اب اس کی عملی صورتیں بھی ظاہر ہونے لگی ہیں)

اس گوشہ سے مراد وہ مسلمان ہیں جو باقاعدہ عالم ومفتی بننے کے لیے فارغ نہ ہوسکتے ہوں، لیکن اپنی دینی ضرورت کا علم حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہوں، ان کے لیے کوئی ایسا منہج مرتب کرنا کہ مختلف شعبہائے زندگی سے وابستہ طبقہ اپنے پیشے میں رہتے ہوئے ضرورت کا علم حاصل کرسکے، چنانچہ امت کے نباض محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ آج سے ۴۰/سال پہلے تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس ضمن میں میری ایک خواہش یہ ہے کہ ہمارے مرکزی مدارس میں جہاں علمی نصاب وعملی تحقیقات کے لیے کوشش ہو، اس کے ساتھ ایک ایسا مختصر نصاب ان حضرات کے لیے مقرر کیا جائے جو انگریزی تعلیم سے بقدرِ ضرورت فراغت پاچکے ہیں، وہ مدرس وعالم بننا نہیں چاہتے، بلکہ صرف اپنی دینی ضرورت کے پیش نظر قرآن وحدیث اور اسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک سہ سالہ نصاب مقرر کیا جائے.....''

(دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب ونظام تعلیم، جمع وترتیب: حضرت مولانا محمد انور بدخشانی)

اس لیے امت کے بہی خواہوں کی کوشش رہی کہ مسلمانوں کے تمام طبقات میں دین زندہ ہونا ضروری ہے، ورنہ خود کے لیے بھی دین پر چلنا مشکل ہوگا، امت مسلمہ کو جسم انسانی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے انسانی جسم باہم مربوط ہے، ایسے امت مسلمہ اور اس کے طبقات باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے از حد ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام شعبہائے زندگی میں احیاءِ دین کی فکر کی جائے، خواہ وہ تجارت ہو یا ملازمت، صنعت وطب وعلاج، نظام عدل ہو یا پولیس، عصری تعلیم گاہیں ہوں یا زراعت یا زندگی کا کوئی اور شعبہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا یہ اعلان مشہور ہے کہ ''**لایبیع فی سوقنا إلا من تفقه فی**

الدین ‘‘ (ہمارے بازار میں صرف وہی کاروبار کرے جو تجارت کے دین سے واقف ہو)

نیز امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے الرسالہ میں اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ کسی مکلّف کے لیے احکام کو سیکھے بغیر معاملہ کرنا جائز نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں طلب علم کی عمومی شکل

چنانچہ ہمارے زمانے کے برخلاف‘ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں عمر و پیشہ دین سیکھنے میں حارج اور مانع نہیں ہوا کرتا تھا۔ نمونہ کے طور پر چند روایات ملاحظہ کریں:

۱:.... ’’حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی تھے، ایک ان میں سے کچھ کمائی کرتا تھا اور دوسرا بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر دین سیکھتا تھا، پہلے بھائی نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسرے بھائی کے بارے میں کمائی میں نہ لگنے کی شکایت کی تو ارشاد فرمایا: تمہیں کیا خبر، شاید تجھے روزی اسی کی برکت سے ملتی ہو!۔‘‘ (مشکوٰۃ)

۲:.... ’’حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انصار میں ستر آدمی ایسے تھے جو رات ہوتے ہی مدینہ میں اپنے ایک معلم کے پاس چلے جاتے اور رات بھر قرآن سیکھتے اور صبح کو لکڑیاں کاٹنے اور میٹھا پانی بھرلانے کی مزدوری میں لگ جاتے۔‘‘ (حیاۃ الصحابہؓ)

۳:.... ’’حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ کا طویل قصہ مسند احمد کے حوالے سے حیاۃ الصحابہؓ میں درج ہے، جس میں یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمد کی غرض پوچھی تو عرض کیا: میری عمر زیادہ ہوگئی ہے، ہڈیاں گل گئی ہیں (لیکن) آیا صرف اس لیے ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسی بات سکھا دیں جس سے اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ دے۔‘‘

دراساتِ دینیہ کورس

زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ اور عمر رسیدہ ایسے احباب کی دینی طلب کی قدر دانی کرتے ہوئے اور اپنا فرض منصبی نبھاتے ہوئے وفاق المدارس العربیہ کے اکابر نے گزشتہ سالوں میں دراساتِ دینیہ کا ۳ ؍سالہ کورس مرتب کیا جس کو بعد میں مزید سہولت کے پیش نظر دو سالہ کر دیا گیا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کورس کا سرسری خاکہ

۱:....تفسیر	مکمل قرآن
۲:....حدیث	معارف الحدیث (مکمل)
۳:....فقہ	بہشتی زیور
۴:....صرف ونحو	علم الصرف وعلم النحو (مکمل)

۵:.....ادب عربی الطریقۃ العصریۃ وقصص النبیینؑ

بلاشبہ اس نصاب میں تبدیلی وبہتری کی گنجائش محسوس ہوسکتی ہے (جوکہ ہر نصاب کا خاصہ ہے) لیکن پھر بھی یہ نصاب خیرکثیر سے خالی نہیں، اس کے شاہد وہ تمام حضرات ہیں جو اس طرح کی کسی بھی سرگرمی سے وابستہ ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ اس سال جامعہ کی مجلس تعلیمی نے بھی جامعہ میں اس کورس کے اجراء کا قابل تقلید فیصلہ فرمایا اور داخلہ کا اعلان کیا گیا، خوشگوار بات دیکھنے کو ملی کہ مختلف عمر ومختلف پیشوں اور ڈگریوں کے حامل تقریباً ۸۰/احباب نے کورس میں دلچسپی لی، پھر ان کی سہولت کے لیے ان معمر طلبہ کو دو الگ مرحلوں (شفٹوں) میں تقسیم کیا گیا۔

بالعموم تجارت پیشہ احباب کے لیے صبح ۷:۳۰ تا ۹:۳۰ اور ملازمین کی سہولت کی خاطر ان کے لیے مغرب تا رات ساڑھے نو بجے کا وقت تجویز ہوا۔ جمعہ اور اتوار کو تعطیل رکھی گئی ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ ان احباب - جن کو اب ''طلبہ'' ہونے کا شرف بھی حاصل ہوگیا - کی رغبت، شوق اور اہتمام دیدنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو استقامت عطا فرمائے۔

آخری گزارش

اس ساری کارگزاری کا مقصد علماء کرام، اربابِ مدارس اور ائمہ مساجد کی اس طرف توجہ دلانا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ''**الناس معادن کمعادن الذهب والفضة**'' کے پیش نظر مسلمانوں کا یہ طبقہ بہت ذی استعداد بھی ہے اور محبت وشفقت کا متلاشی بھی:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

کیا ہی اچھا ہوا اگر ہر مدرسہ ومسجد کی طرف سے اپنے اپنے دائرے میں اس طبقہ کو اپنی دینی تعلیمی خدمات مہیا کی جائیں۔ نصاب تو ہر کوئی اپنا بنا بھی سکتا ہے، مگر وفاق کے اجتماعی دھارے میں رہنا بجائے خود ایک خوش آئند اور باعث سہولت امر ہوگا۔

نیز یہ کورس نوجوان فضلاء کو محنت کا ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے، جس کے لیے ہمیں اللہ نے مسجد کا ایسا خوبصورت نظام دیا کہ ہر مسجد اس کام کے لیے مرکز بنائی جاسکتی ہے۔

وہ دن دور نہیں جب امت کے تمام افراد اپنے تمام شعبوں میں علماء واہل فتویٰ کی رہنمائی میں اپنی زندگی کا سفر طے کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ نصیب فرمائے، اس کی تعلیم وتبلیغ اور ترویج واشاعت کے لیے ہمیں توفیق بخشے، آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آله وصحبه أجمعين

تحریک پاکستان میں علماء کا کردار

ایک پروپیگنڈے کا جواب

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

سوال

پاکستان کو آزاد کرانے اور پاکستان کے بننے میں اور پاکستان کو آج تک قائم اور دائم رہنے میں علمائے کرام کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، یہ سب جانتے ہیں، لیکن اس مضمون پر قدرے تفصیل سے حوالوں کے ساتھ گفتگو کردیں تو مفید ہوگا کہ پاکستان کو آزاد کرانے میں علماء کا کیا ہاتھ تھا؟ اور کون کون سے علماء اس میں شامل تھے؟ اور آج تک کیا حال رہا؟ جو لوگ علماء کو دشمن سمجھتے ہیں، ان کے لیے بھی آپ کا تفصیلی جواب بہت مفید ہوگا۔ اس موضوع پر مفید کتابوں کی راہ نمائی بھی فرمادیں۔ سائل: محمد عبداللہ بذریعہ ای میل

جواب

تحریک آزادی اور قیام پاکستان دونوں کا الگ الگ پس منظر ہے، اُسے سمجھنے کے بعد ہی سائل کے سوال کا جواب اور قیام پاکستان کی تاریخ کا اصلی رُخ پیش کیا جاسکتا ہے۔ تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے جداگانہ پس منظر کے سمجھے بغیر علماء کا کردار واضح نہیں ہوسکتا۔

جو تاریخی خلجان محترم سائل کو درپیش ہے یا بعض لوگ اس نوع کے مجمل سوالات کے ذریعہ مزعومہ جوابات تک رسائی کے متمنی ہوتے ہیں، یہ ان کا دیدہ دانستہ طریقہ ہے، وہ ہمیشہ قیام پاکستان اور پاکستان کی آزادی کے معاملے کو خلط ملط کر کے ہی سوالات کریں گے۔ یہ سوالات زبردست چالاک سیاسی فکر کی پیداوار ہیں۔ اس طرح کے اختلاطی سوال کر کے عام طور پر نئی نسل کو ایک تو مخصوص ذہنیت دینا مقصود ہوتا ہے، دوسرا ماضی کے آئینہ کو ایسا پراگندہ کرنا ہے کہ جس میں ہماری بعض مقدس ہستیوں کے اصل چہرے مدہم دکھائی دیں، جن کا استخلاصِ وطن (انگریز سے وطن چھڑانے) میں کوئی حصہ تو نہیں ہے، لیکن قیام پاکستان کا سہرا سر پر سجانے کے لیے اکیلے حق دار شمار

ہوتے ہیں۔ عقل و دانش کا حامل ہر انسان جانتا ہے کہ آزادی قبضہ یا قید سے خلاصی کا نام ہے، اس لیے پاکستان کی جو آزادی ہمیں باور کرائی جاتی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے قبل پاکستان پر قبضہ کی تاریخ بتائی جائے اور قبضہ کی تاریخ سے لے کر یومِ آزادی تک قابضین سے قبضہ چھڑانے یا بالفاظِ دیگر استخلاصِ وطن کی پوری تاریخ کو سامنے رکھا جائے۔

سرزمین ہند کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم واقف ہے کہ ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی اپنے عروج سے زوال تک تین صدیوں سے زیادہ عرصہ (۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء) حکومت قائم رہی، سن ۱۵۹۹ء میں مغربی شاطر، سیاسی فکر، تاجرانہ روپ میں ارضِ ہند پر وارد ہوئی، ابتدائی طور پر باقاعدہ شاہی رسوم وآداب کے مطابق بادشاہِ وقت کی خدمت میں سلامی ونذرانے پیش کرتے رہے، رفتہ رفتہ تجارتی مراسم کے ذریعہ باہمی اعتماد کی فضا بنا کر اپنے سامانِ تجارت کے لیے گودام اور گودام کی حفاظت کے لیے مسلح گارڈ کے اجازت نامہ کے ذریعہ اسلحہ وبارود لایا گیا، آگے چل کر بڑے شہروں میں قائم یہی گودام درحقیقت انگریز کی عسکری چھاؤنیاں ثابت ہوئے، اور بالآخر سن ۱۸۵۷ء میں آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے برطانوی سامراج ارضِ ہند کا فرمانروا بن بیٹھا، اور برطانوی سامراج کا یہ قبضہ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تقریباً ایک صدی پر محیط رہا، اس دوران اس ناجائز قبضہ سے ارضِ ہند کی خلاصی کے لیے کئی معرکے لڑے گئے، جن میں سرفہرست بالاکوٹ کا میدان کارزار ہے، شاملی کا معرکہ اور تحریک ریشمی رومال اور دیگر چھوٹی بڑی تحریکیں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ ①

تحریکِ استخلاصِ وطن درحقیقت ان دردمند مسلمانوں کی اندرونی کڑھن کا نتیجہ تھی، جن کو ہر لحظہ یہ خیال ستاتا تھا کہ برطانوی سامراج نے اپنی شاطرانہ چالوں کے جال بن کر مسلمانوں سے اقتدار چھینا ہے، لہٰذا یہ اقتدار دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ آنا چاہیے۔ یہ جذبہ محض حب الوطنی کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ مسلم قیادت اسے اپنا دینی فریضہ بھی سمجھتی تھی۔ ظاہر ہے کہ دورِ غلامی میں حب الوطنی کا یہ جذبہ آس ویاس کے بیچ ہچکولے ہی لے سکتا تھا۔ عملی میدان میں اترنے کے لیے درکار وسائل کے بغیر کوئی انقلابی قدم اٹھانا کیونکر ممکن تھا، یہی وجہ ہے کہ ارضِ ہند میں ہندو اکثریت کے باوجود استخلاصِ وطن کی ابتدائی تحریک میں ہندو قیادت کی خاطر خواہ دلچسپی نہیں تھی اور مسلمانوں میں سے بھی صرف دینی قیادت ہی اپنے ایمانی جذبے اور مذہبی فریضہ کے طور پر اپنی جانوں پر کھیلنے کو تیار ہوسکتی تھی، چنانچہ انہیں نعرہائے آزادی کے اسی جرم کی پاداش میں انگریزی دور میں مختلف مقامات پر ہزاروں علماء کو سولی پر لٹکا دیا گیا، توپوں کے دھانوں پر باندھ کر اُڑایا گیا اور قید وبند کی صعوبتوں کی تاریخ تو مالٹا سے لے کر مالدیپ تک ہر جیل کے درودیوار پر کندہ ہے۔

استخلاصِ وطن کے لیے، پورے پورے ملک کی آزادی کے لیے ان ساری قربانیوں میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف علمائے ہند بالخصوص علمائے دیوبند اور ان کے پیروکاروں کا ہی نام ملے گا، ② حتیٰ کہ مسلم قیادت کے غیر علماء میں سے کوئی بھی نامی گرامی شخصیت ایسی

نہیں ہے جس نے آزادیٔ وطن کے لیے جان دی ہو، یا کم ازکم جیل یاترا کی سعادت پائی ہو، کیونکہ قربانی محض مذہبی وایمانی جذبہ کا ہی ثمرہ ہوا کرتا ہے اور مذہب وایمان سے بھلا علماء سے بڑھ کس کا رشتہ ہوسکتا ہے۔ ان علماء میں سرفہرست ۱۷۵۸ء میں تحریک آزادی اور قیام خلافت کا ابتدائی بیج بونے والے شاہ ولی اللہؒ، ان کا خاندان، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ، ان کے بعد حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا جعفر تھانیسریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالماجد قادری بدایونیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا محمد میاں انصاریؒ، مولانا عبدالقدوسؒ، مفتی محمد صادق کراچویؒ وغیرہ (رحمۃ اللہ علیہم) شامل ہیں۔

جب علما کی قربانیوں کے نتیجے میں آزادیٔ ہند کی تحریک پھیلنے لگی تو اس کے وسیع دائرے میں کئی مسلم وغیر مسلم سیاسی رہنما بھی شریک سفر بنتے چلے گئے، اسی طرح ۱۸۸۵ء میں ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر اجنبی دشمن سے آزادیٔ ہند کے لیے ایک بڑا الائنس (کانگریس) بھی وجود میں آ گیا، جس میں مسلم اور ہندو سیاسی قیادت یکجا دکھائی دینے لگی، یہ وحدت محض سیاسی وحدت تھی اور اس نکتہ پر قائم ہوئی تھی کہ ارض ہند پر اقتدار کا حق اہل ہند کو ہے، اجنبی قابضین کو ملک بدر ہونا چاہیے، ③ یہ سیاسی فکر اسلامی اصولوں سے متصادم نہیں، بلکہ ہم آہنگ تھی، اور اس اتحاد کی بنا پر ہندو اکثریت مسلمانوں کی جانب سے اُٹھائی گئی تحریک آزادی کی سپورٹر ثابت ہو رہی تھی، ④ جس کے نتیجے میں قابض سامراج ملک بدری کے لیے مجبور ہو رہا تھا، چنانچہ اس نے جاتے جاتے ایک اور شاطرانہ چال چلائی کہ پہلے مسلم و ہندو اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی جس میں کسی حد تک کامیاب رہا، لیکن انگریز کو اس سے بڑی کامیابی بایں طور حاصل رہی کہ سامراج کے خلاف بغاوت میں بنیادی کردار ادا کرنے والی مسلم قوم سے انتقام لینے کے لیے اسے ایسی راہ پر الجھا گیا کہ وہ اپنی حقیقی مطلوبہ منزل (کل ہندوستان پر دوبارہ حکومت) کو ہرگز نہ پاسکیں، انگریز کو یہ بڑی کامیابی اس وقت میسر آئی جب مسلم قیادت جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ کے عنوان سے تقسیم ہوکر آزادیِ ہند کے فارمولے پر ایک دوسرے سے جداگانہ مطالبے کی حامل بن گئی، جمعیت علمائے ہند اپنے پرانے مطالبے (کل ہند کی آزادی) کو آزادی سمجھنے پر مصر تھی، جبکہ مسلم لیگ تقسیم ہند کے فارمولے کو آزادی سمجھ رہی تھی۔ ⑤

ہمارے اس نظریاتی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز بہادر قاضیِ انصاف بن کر کرسی قضا پر براجمان ہوا اور فریقین کے طور پر فیصلہ سنانے کے لیے ہمیں سامراجی کٹہرے میں لا کھڑا کیا، انصاف سے دیکھا جائے تو تقسیم کے فارمولے پر رضامند ہونا مسلم لیگ سے زیادہ جمعیت علمائے ہند کی

سیاسی وفکری خودکشی تھی، کیونکہ استخلاصِ وطن کے لیے ان کے آباواجداد کی کاوشیں ملک کے کسی ایک حصہ کے لیے نہیں، پوری ارضِ ہند کے لیے تھیں، اسی بنا پر ان کا مؤقف یہ تھا کہ ملک کا بٹوارا آزادیِ ہند کے شہداء کے خون اور غازیوں کی جدوجہد سے غداری ہے، نیز یہ کہ ہماری دھرتی ہم سے چھینی گئی ہے تو غاصب کو ہمارے درمیان کسی بھی نوع کے فیصلے اور انصاف کا کیا حق ہے؟ اس کا انصاف تو فقط یہ ہے کہ وہ ناجائز قبضہ ختم کرے، ہماری دھرتی کی تقسیم کا اسے کوئی اختیار نہیں۔

مگر دوسری طرف تقسیم کے حق میں مسلم و ہندو قومیتوں کے درمیان اشتراکی عمل کو سیاسی مسئلہ سے آگے بڑھا کر مذہبی وفقہی مسئلہ بھی بنا دیا گیا تھا، اور مسلم لیگی قیادت نے مسلم و غیر مسلم کے اشتراک عمل کو ہم نوا دینی قیادت کے ذریعہ ایسا حرام و ناجائز باور کرایا کہ ملک کی سیاسی تقسیم، اسلامی وفقہی جغرافیہ بن کے رہ گئی، اور پاکستان کا مطلب کیا: ''لاالٰہ الااللّٰہ محمدرسول اللّٰہ'' کا جذباتی نعرہ ایسا بلند ہوا کہ مسلمانانِ ہند کی کثیر تعداد کلمہ طیبہ کے احترام میں اور اس کے ضمن میں ظاہر کردہ نیک مقاصد کی تلاش میں تقسیم ہند کے فارمولے پر رضامند ہوگئی۔ اور شاطر انگریز، مسلم قوم کو پوری ہندوستانی سلطنت و حکومت لوٹانے کی بجائے ایک ایسے حصے پر قانع کر گیا جو پہلے ہی سے مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا، اگر انگریز بہادر نے اپنی روایت کے مطابق واقعی انصاف فراہمی کا فریضہ نبھانا تھا تو اولاً مساویانہ تقسیم ہوتی، آدھا ہندوستان مسلم قوم اور آدھا غیر مسلم قوم کو دے دیتا، یا کم از کم ہندو اکثریتی علاقوں میں سے کچھ حصہ ہندوؤں سے لے کر مسلمانوں کو دے دیتا، جسے انگریز کی طرف سے مسلم قوم کے لیے ''دین'' اور ''عطاء'' کہا جاسکتا، کیونکہ انگریز سرکار کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ کسی کی بھی زمین لے کر اپنی وفاداری کے صلے میں کسی اور کو دے دیا کرتا تھا، مگر ایسا بھی نہ ہوا۔ اگر مسلم اکثریتی خطوں کی بنیاد پر تقسیم ہی انگریزی مذہب کے عہدِ عتیق میں رقم تھی تو کم از کم تقسیم کی جغرافیائی لکیر، لفظ ''پاکستان'' کے گمنام خالق مرحوم چوہدری رحمت علی کے مجوزہ فارمولے کے مطابق ہوجاتی، یعنی عثمانستان، بانگ اسلام اور پاکستان تو مسلمانوں کو بٹوارے میں فائدہ ہوتا۔ ⑥ مگر بدقسمتی سے ایسا بھی نہ ہوسکا، بلکہ پہلے سے ہمارے زیر ملک ہماری زمین ہمیں ہی خیرات میں چھوڑ کر ہمیں اپنا ممنون احسان بنا کر انگلستان سدھار گیا، اور طوقِ غلامی اپنے ہاتھ سے اپنے بڑے بھائی (امریکہ) کے ہاتھ تھما کر چلا گیا، اور ہم سادگی میں آزادی کے شادیانے ہی بجاتے رہ گئے۔ اور تقسیم کے حوالے سے اپنے نفع ونقصان کی درست تشخیص نہ کر پائے۔

اگر اس تاریخی پس منظر کے تناظر میں دیکھا جائے تو کوئی عالم دین اور سیاسی شعور کا حامل انسان شاید ہی ایسی تاریخ کا حصہ شمار ہونے کے لیے رضامند ہوسکے، مگر طرفہ یہ کہ مکار دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان کے فارمولوں کو ٹھکرانے والے انگریز دشمن علماء کو ''قیامِ پاکستان کا دشمن'' قرار دیا جاتا ہے، اس انگریز دشمنی کو پاکستان دشمنی کہنا ایسے ہی غلط ہے جیسے تقسیم کو آزادی کہنا۔

اگر آزادیِ وطن کے روایتی مفہوم اور قیامِ پاکستان کے دینی نعرے کے نام پر قربانی کے عنوان

www.banuri.edu.pk

سے علماء کا کردار سمجھنا چاہیں تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کے دینی نعرے کی بنیادوں سے لے کر پہلی قومی پرچم کشائی تک اکابر علمائے دیوبند میں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اوران کے متوسلین کی تائید وحمایت نہ ہوتی تو قیام پاکستان کوکبھی بھی دینی نعرے کی بنیاد پر حاصل نہ کیا جاسکتا تھا، مسلم قوم محض لیگی قیادت کے تدین کی بنیاد پر تقسیم کے فارمولے کوکفر واسلام کا فارمولا ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قائداعظم سے سوال کیا گیا کہ مذہب کی بنیاد پر تقسیم کی صحت وسند کے لیے کون سے علمائے مذہب آپ کے ساتھ ہیں؟ تو قائد کا جواب تھا: ’’مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم (حضرت تھانوی) ہے، جس کا علم وتقدس وتقویٰ سب سے بھاری ہے، اور وہ ہیں مولانا اشرف تھانوی، جو چھوٹے سے قصبے (تھانہ بھون) میں رہتے ہیں، مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے۔‘‘ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو قیام پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے، لیکن ان کی فکر کے حامل ان کے خواہر زادے شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ قیام پاکستان کی باقاعدہ رسومات میں اول دستہ رہے، چنانچہ مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پرچم کشائی فرمائی اور مشرقی پاکستان میں علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قومی پرچم لہرایا اوران ہی بزرگوں کی کاوشوں سے قراردادِ مقاصد تیار ومنظور ہوئی۔

یہاں تک پاکستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام میں علماء کی ضرورت اور کردار کا ایک پہلو سمٹ جاتا ہے، اور قیام پاکستان کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے بعد وطن عزیز انگریز کی پروردہ تربیت یافتہ بیوروکریسی کے حوالے ہوجاتا ہے، اب پاکستان کے مطلب کی تعیین، تشریح اور عملی تطبیق انہیں ’’مخلصین دین وملت‘‘ کے سپرد ہوجاتی ہے اور گویا علماء کی ضرورت پوری ہوگئی اوران کے ’’ناتواں کندھوں‘‘ سے پاکستان کے مطلب کی تعیین وتطبیق کا بوجھ اٹھالیا جاتا ہے، یہاں تک کہ قائداعظم کی خواہشات وسفارشات کوبھی بڑھاپے کی ناکارہ آرزؤوں کی ٹوکری میں پھینک کر مغرب کی کورانہ تقلید کی رسم بڑھائی جاتی ہے اور ماہ وسال کے گزرنے کے ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ ⑥

لیکن اب بھی علمائے اسلام ان حقائق سے بخوبی آگاہ وآشنا ہونے کے باوجود قیام پاکستان کے حقیقی مقاصد کے حصول کے لیے مسلسل اپنا کردار ادا کررہے ہیں اور تقسیم کے فارمولے سے دور اندیشانہ سیاسی اختلاف کے حاملین علماء ہوں یا ہندوستان کی تقسیم کوشرعی تقسیم کہنے والے علماء، سب کا اس پر اتفاق ہوچکا ہے کہ پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آنے والی مملکت خداداد کا تحفظ ودفاع اور اسے اس کی حقیقی منزل تک لے جانا تمام علمائے امت کا مذہبی فریضہ بن چکا ہے، تقسیم کے نتیجے میں ایک حقیقت سامنے آجانے کے بعد اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ کسی مقام پر مسجد کے بننے نہ بننے میں اختلاف ممکن ہے، لیکن اختلاف کے باوجود جب اسی مقام پر مسجد بن جائے تو اس کا تقدس وتحفظ اور تعمیر وترقی، مذہبی ضرورت اور فریضہ بن جاتا ہے، ⑧ لہٰذا جمعیت علمائے ہند کے نظریۂ آزادی کے حامل علماء ہوں یا مسلم

www.banuri.edu.pk

لیگ کے نظریۂ تقسیم و آزادی کے حامل علماء ہوں، بلکہ کسی بھی مسلک کے علماء ہوں، سبھی یکجا ہو کر ملک کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ، دفاع اور بقا و استحکام کے لیے ہر ممکن تگ و دو کرتے چلے آئے ہیں، مگر انصاف سے کہا جائے تو قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو ''**لا إلٰہ إلا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ**'' کے مطلب و مقصد کی گم کردہ منزل کی طرف لے جانے میں ان علماء کا حصہ زیادہ ہے جو عام طور پر قیام پاکستان کی مخالفت کے الزام اور پروپیگنڈے کا نشانہ بنائے جاتے رہے ہیں۔

چنانچہ آزادی کے بعد علماء کی ایک جماعت کی پیش کردہ متفقہ قراردادِ مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے، ۱۹۵۲ء کا آئین اور ۱۹۷۳ء کا آئین علماء ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اور تحریک نظام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے قربانیاں بھی علماء نے دیں، قراردادِ مقاصد سے لے کر یہاں تک جن علماء کے نام لیے جاسکتے ہیں، ان میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، محدث بے مثال علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد ادریس کاندہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ، ضیغم اسلام مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ، مفکر اسلام مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک رحمۃ اللہ علیہ، قاضی عبدالصمد سر بازی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حبیب اللہ ٹھیٹری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد صادق کراچوی رحمہم اللہ جمیعاً کے اسماء گرامی پاکستان کی آئینی تاریخ کا حصہ ہیں۔

اب بھی الحمدللہ! انہی بزرگوں کی روحانی اولاد وطن عزیز کو قیام پاکستان کے حقیقی مقصد تک پہنچنے کے لیے ہر محاذ پر کوشاں ہے، مگر سامراج سے متأثر طبقہ نہ صرف یہ کہ علماء دین کو قیام پاکستان کے مقصد کی طرف بڑھنے نہیں دیتا، بلکہ اس طرف توجہ دلانے کو ملک دشمنی اور ملک سے غداری قرار دیتا ہے، لیکن بہی خواہانِ پاکستان کو مژدہ ہو کہ یہ علماء کرام ان روحانی ہستیوں کے فیض یافتہ ہیں جو تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اللہ کی مدد کے ساتھ اپنے اس مقصد پر کاربند بھی رہیں گے اور قیام پاکستان کے اصل مقصد کو بھی عوام کے سامنے تازہ کرتے رہیں گے اور اس خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، کیونکہ علماء کرام کا یہ طبقہ مملکت خداداد پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے دعا گو ہے، اسی طرح اس کی نظریاتی حدود کی حفاظت کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔

مذکورہ بالا تاریخی حقائق کا منصفانہ اور حق جویانہ مطالعہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا:

۱:...... برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟، از حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۲:......علمائے ہند کا شاندار ماضی، از مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

۳:......تاریخ دعوت و عزیمت، از مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴:......تحریک پاکستان میں علماء کا سیاسی و علمی کا کردار، از ڈاکٹر ایچ بی خانؒ

۵:......سیاسی ڈائری از مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حواشی وحوالہ جات

①:...... ملاحظہ فرمایئے: مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوریؒ، باب سوم: ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھائی سو سال۔

-- برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

-- علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد سوم، چہارم وپنجم) از مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ۔

-- ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی کتاب ''بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں'' شائع کردہ: قندیل لاہور، اسلام آباد۔

②:...... ۱۸۵۷ء کی جنگ کے حالات کے لیے خاص طور پر ملاحظہ فرمائیں:

بہادر شاہ ظفر کے داروغہ ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی کتاب ''۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات المعروف داستان غدر'' مطبوعہ حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور۔

-- طفیل احمد منگلوریؒ نے بھی اس دور میں انگریز کے مظالم کی کچھ روداد خود فرنگی مورخین ہومز، تھامسن، ولیم میور اور فریڈرک کوپر کے اعترافات کی صورت میں نقل کی ہے، دیکھیں: مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص: ۸۰ تا ۸۲۔

-- غدر کی وجوہات پر سید احمد خان کی ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' بھی قابل مطالعہ ہے۔

③:...... کانگریس کے قیام کی تاریخ و مقاصد اور علمائے ہند کے اس سے تعلق کے متعلق مستند تفصیلات کے لیے دیکھئے: علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، باب چہارم وپنجم، مطبوعہ الجمعیۃ پبلیکیشنز۔

④:......اس مناسبت سے بابر کی وہ وصیت بھی پڑھتے جایئے جو مغلیہ سلطنت کا سنگ بنیاد اور کئی صدیوں کے ہندو مسلم باہمی خوشگوار تعلقات کی بنیاد و اساس ہے، بابر نے ہمایوں سے کہا تھا: ''اے پسر! سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے، الحمدللہ! اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی، تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصّباتِ مذہبی کو دل سے دھوڈالو اور عدل وانصاف میں ہر مذہب وملت کے طریق کا لحاظ رکھو، جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کرسکتے ...... جس طرح انسان کے جسم میں مل جل کر چار عناصر کام کررہے ہیں، اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا کر رکھو اور ان میں اتحادِ عمل پیدا کرو، تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ رہے۔'' (علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، ص: ۴۰)

اس کے برعکس ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے فلسفے پر عمل پیرا شاطر انگریز کا طریقۂ واردات کیا تھا؟ جان میکلم کی سنئے:

''اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں، ان کی عام تقسیم ہو، اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں، جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے، اس وقت تک غالبًا کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔'' (ایضا، ص: ۴۱)

⑤:...... اس اجمال کی تفصیل کے لیے دیکھئے: آزادی ہند از مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

-- برطانوی سامراج نے ہمیں کیسے لوٹا؟ از مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

⑥:...... ملاحظہ فرمایئے: چوہدری رحمت علی کا کتابچہ: ''NOW OW NEVER'' شریعہ اکیڈمی اسلام آباد نے اپنی مطبوعہ کتاب ''تصورِ پاکستان، بانیان پاکستان کی نظر میں'' کے آخر میں یہ مختصر تحریر بھی شائع کردی ہے۔

⑦:...... بانی پاکستان کے بعض افکار وارشادات کے لیے ملاحظہ کیجئے: ''تصور پاکستان، بانیان پاکستان کی نظر میں''

⑧:......حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اس نوع کا جملہ تو مشہور ہے، مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا تھا: ''پاکستان وجود میں آگیا ہے تو اب اُسے باقی رہنا چاہیے، اس کا بگڑنا سارے عالم اسلام کے لیے شکست کے برابر ہوگا۔'' (نوائے وقت، ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء)

درد کا حد سے گزرنا ہے‘ دوا ہوجانا

مولانا نورعالم خلیل امینی (انڈیا)

اللہ پاک نے اپنی زِندہ جاوید کتاب میں معجزانہ اور بلیغ اُسلوب میں فرمایا ہے کہ مومنوں کی صفات میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، بڑے بڑے گناہوں اور بدکاریوں سے بچتے ہیں، غصے کے وقت لوگوں کو معاف کردیتے ہیں، اپنے رب کی بات مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، دین و دنیا کے معاملات میں آپس کے مشورے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھاتے ہیں، ہمارے عطا کردہ رزق سے خرچ کرتے ہیں اور جب ظلم و جور کا شکار ہوں تو انتقام لیتے ہیں:

’’اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے، بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے واسطے ایمان والوں کے جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو لوگ کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے اور جب غصہ آوے تو وہ معاف کردیتے ہیں اور جنہوں نے کہ حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو اور کام کرتے ہیں مشورے سے آپس کے اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ کہ جب ان پر ہووے چڑھائی تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔‘‘ (الشوریٰ:۳۶ تا ۳۹، ترجمہ: شیخ الہندؒ)

آیت کریمہ میں ’’يَنْتَصِرُوْنَ‘‘ کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ انتہائی بھرپور معنی کا حامل ہے، اس کے معنی: کامیابی، فوز وفلاح، غلبہ وفتح مندی، انتقام، دوسروں کی نصرت ومدد اور حق وانصاف کی مدافعت وغیرہ ہے، لہٰذا آیت کا مطلب ہوگا کہ جب اہل ایمان کو ظلم وتعدی سے سابقہ ہوتا ہے تو اس سے بھرپور انداز میں نمٹتے ہیں، کامیابی حاصل کرتے ہیں، ظالموں پر فتح پاتے ہیں، غلبہ وسربلندی کو روبہ عمل لاتے ہیں، اللہ کی مدد سے ظالموں سے انتقام لیتے ہیں، کیونکہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ مظلوموں کی مدد کرتا ہے، ظلم وجور کا نشانہ بننے والوں کا ساتھ دیتا ہے اور فتح مندی وغلبے کے ذریعے ان کی اشک شوئی اور خبرگیری کرتا ہے۔

یہ آیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے بڑی بشارت کی حامل ہے، اس وقت ساری دنیا میں ہمیں ظلم وجور کا سامنا ہے، لامحدود ظلم وتعدی کا ہمیں شکار بنایا جارہا ہے، ہمیں پیہم اور بغیر کسی وقفے کے جسمانی وذہنی عذاب میں مبتلا رکھا جارہا ہے، ہمیں ہر طرف سے گھیرا جارہا ہے، ہمارا پیچھا کیا جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مظلومی کی یہ صورتِ حال ہمارا مقدر اور ہمارا نصیبہ ہے۔ یہ صورتِ حال ہم میں

سے بہت سے لوگوں کے لیے مایوسی اور احساسِ محرومی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ بہت سے مسلمان زبان حال وزبان قال دونوں سے یہ کہنے لگے ہیں: ''مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ'' (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) اس کے جواب میں سنت اللہ گویا یہ پکار کے کہہ رہی ہے: ''أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ '' (ہاں سنو! اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے) بلا شبہ اللہ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ ظلم کا لازماً ازالہ کرتا رہا ہے، باغیوں، سرکشوں، گردن فرازوں، ظلم وجور کے ناخداؤں اور غرور وتکبر وبربریت کے ''ربِ اعلیٰ'' سب سے بڑا خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو مٹاتا اور اپنے عدل وانصاف کے قانون محکم کے ذریعے انہیں ان کے منطقی انجامِ بد تک پہنچاتا رہا ہے۔ وہ آخرت سے پہلے دنیا میں ان کی بھرپور اور کھلم کھلا رسوائی و جگ ہنسائی کا انتظام کرتا رہا ہے، اس کی سنت ڈھیل دینے کی رہی ہے، لیکن چھوڑ دینے اور بالکل طرح دینے کی نہیں رہی ہے، لیکن ہم انسان ضعیف البنیان اور اسی خدائے عالم الغیب کے بقول عجلت پسند جو پیدا کیے گئے ہیں، تو ہم زندگی کے تمام مسائل کے حوالے سے عجلت پسند اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ ہم انتظار کرنے اور آہستہ روی کے قائل نہیں، ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہر کام ہماری خواہش کے مطابق اور ہماری چاہت کے بقدر اور ہماری بے حساب تمنا کے معیار پر ہمارے مقرر کردہ وقت پر ہی ضرور ہو جایا کرے، ورنہ ہماری بے تابی دیدنی ہوتی ہے۔

بہرصورت ہم اس وقت ظلم و جور کی ہر نوع کا شکار ہیں، لیکن یہی صورت حال ہماری فتح مندی، ہمارے غلبے، ہماری بھرپور کامرانی وشادمانی کا یقینی پیام بھی ہے۔ ہم خدائے لم یزل کے دست قدرت کے طفیل ظالموں سے ضرور بدلہ لیں گے، ہم حق وعدل کے لیے ضرور کامیاب ہوں گے، کیونکہ ہم اس کے سچے نمائندے اور واحد علمبردار ہیں۔ آیت کریمہ صاف طور پر بتاتی ہے کہ اللہ پاک کا مظلوم، مومنوں سے فتح مندی اور غلبہ دینے کا یہ وعدہ ہے۔ آیت صرف یہی نہیں بتاتی کہ یہ حقیقت رونما ہو کے رہے گی، بلکہ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ مظلوم مومنوں کے لیے یہ محکم وعدۂ الٰہی ہے جو بہرصورت پورا ہو کے رہتا ہے، خواہ ظالموں کو پسند ہو یا ناپسند ان کے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا، انہیں اپنے ظلم کا تلخ مزہ چکھنا ہوگا اور مظلوموں کو ان سے انتقام دلایا جائے گا، یہ اسی دنیا میں ہوگا، اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہوگا اور آخرت کا عذاب تو اپنی جگہ ہے ہی، جو اس سے زیادہ شدید اور کماً وکیفاً ناقابل تصور حد تک رسوا کن اور تکلیف دہ ہوگا۔ (العیاذ باللہ)

ایک مرتبہ اور آیت کے الفاظ کو ذہن نشیں کر لیجیے:

''وَالَّذِیْنَ إِذَا أَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۔'' (الشوریٰ)

ترجمہ: ''وہ لوگ کہ جب ان پر ہووے چڑھائی تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔''

یعنی وہ اس آبرو کا بدلہ لیتے ہیں جو اُن سے چھین لی گئی تھی، اس عزت کا بدلہ لیتے ہیں جس سے انہیں محروم کر دیا گیا تھا، اس زمین کا بدلہ لیتے ہیں جو اُن سے ہڑپ کر لی گئی تھی، اس امن اور چین کا بدلہ لیتے

www.banuri.edu.pk

ہیں، جس کے لیے اُن کو ترسایا گیا تھا، اس ظلم کا بدلہ لیتے ہیں جو اُن پر ڈھایا گیا تھا، خودداری کی اس زندگی کا بدلہ لیتے ہیں، جس سے ان کو تہی مایہ کردیا گیا تھا اور اس وطن کا بدلہ لیتے ہیں، جس سے ان کو نکالا گیا تھا۔

لیکن اس کے لیے صرف ایک شرط ہے اور وہ ہے ''ایمان'' کی شرط، جو بڑی کڑی، اہم اور کٹھن شرط ہے، کیونکہ اس شرط پر پورا اترنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کو دعویٰ، ریاکاری، سینہ زوری، فخر ومباہات کے سرمایوں، قوتِ بازو، دھوکہ دہی، حیلہ سازی، بہانہ بازی اور ظاہر کی تابنا کی اور باطن کی تیرگی کے ساتھ حاصل نہیں کیا جاسکتا، حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا واقعی وجود ہی ایک انسان کے ہر درد کی شافی دوا اور ہر مسئلے کا مکمل اور کافی حل ہے۔ ایمان سے بڑا مسیحا اس دنیا میں کوئی نہیں، اس سے بڑا سہارا اور ہر مشکل کے بھنور کا مضبوط کنارا دنیا میں دستیاب نہیں۔ اس اکسیر کے بعد کسی فارمولے کی ضرورت نہیں اور اس ماسٹر کی (شاہ کلید) کے بعد کسی کلید کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے انسان کو کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں، وہ زندگی کے ہر معرکے میں بے تیغ لڑ کر اس کو مکمل طور پر سر کرسکتا ہے، اس کے بغیر انسان، کائنات کی ایک کٹی ہوئی پتنگ ہے، ہر سہارے کے باوجود بے سہارا ہے، ہر شفقت کے باوجود، حالات کی ستم ظریفی اور حوادث زمانہ کی تیز دھوپ کا نشانہ ہے۔

آیت میں جو بشارت ہے، وہ محض نام کے مسلمانوں اور صرف مردم شماری کے فارم پر عبدالعزیز اور عبدالوکیل درج شدہ لوگوں کے لیے نہیں، جو اپنے عمل وکردار میں فرعون، ہامان، نمرود، ہٹلر، چنگیز، تیمور، ہلاکو، بش، راون، ابوجہل، ابولہب اور جو اپنے خدا بے زار کرتوتوں کے ذریعے شیطان کو شرمندہ کردینے والے انسان ہوں۔ آیت میں غلبہ وفتح مندی کا الٰہی وعدہ ''ایمان'' رکھنے والوں کے لیے ہے، ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے والوں کے لیے ہے، فواحش ومعاصی سے گریزاں رہنے والوں کے لیے ہے، اقامتِ صلوٰۃ کرنے والوں کے لیے ہے، تمام اوامر ونواہی میں اپنے رب کی ماننے والوں کے لیے ہے، غصے کو پی جانے والوں اور لوگوں کو ممکن حد تک معاف کردینے والوں کے لیے ہے، اللہ پر توکل کرنے والوں کے لیے ہے، جو یقین رکھتے ہیں نصرت و ہزیمت، عزت وذلت، صرف اسی رب ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے، نیز یہ وعدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو دشمنانِ خدا اور رسول کا پیچھا کرنے کے حوالے سے خدائے بے نیاز کا حکم ضرور مانتے ہیں، وہ کسی ''تکلیف'' اور ''بے آرامی'' کی وجہ سے دشمنوں کا پیچھا کرنے میں پیچھے نہیں رہتے اور آرام وراحت کی طلب میں کسی چانس کو اور صحیح موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، وہ پیچھا کرنے کی راہ میں تلوے میں چبھے ہوئے کسی ''کانٹے'' کو نکالنے کی بھی فکر نہیں کرتے، بلکہ باغیانِ خدا اور عاصیانِ رب دوجہاں کے تلوے بھی اسی طرح کے کانٹوں اور ان کے جسم وذہن بھی اسی طرح کی بے آرامی اور فکرمندی سے دوچار ہیں، لیکن وہ سرمایہ ''ایمان'' سے تہی مایہ ہونے کے باوجود اور اللہ کے کسی ثواب کی امید سے یکسر محرومی کے باوصف، اگر ایک لمحے کے لیے بھی مومنوں کا پیچھا کرنے سے غافل رہنے اور اس میں توقف کرنے یا سانس کے قائل نہیں تو بھلا اہل ایمان

کے لیے ذرا بھی ’’وقفۂ استراحت‘‘ کی گنجائش کیونکر ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’اور ہمت نہ ہارو، ان کا پیچھا کرنے سے، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں، جس طرح تم ہوتے ہو اور تم کو اللہ سے امید ہے، جو اُن کو نہیں۔‘‘ (النساء:۱۰۴، ترجمہ: شیخ الہندؒ)

واقعی کتنی سچی اور عبرت خیز بات ہے کہ صلیبی وصہیونی اور طرح طرح کے صنم پرستان جہاں، اپنے کفر وشرک، خدا بے زاری، رب کریم کی رحمت سے مایوسی، اس کے ثواب کے لالچ سے یکسر محرومی کے باوجود، رب رحمٰن سے لو لگانے والے اہل ایمان کی مسلسل مزاحمت اور اس کو حرف غلط کی طرح مٹانے کے عمل سے کسی لمحہ ہار ماننے کو تیار نہیں، تو بھلا اہل ایمان کے لیے یہ کب روا ہے کہ وہ ان کی مزاحمت اور ان کے گھات میں لگے رہنے سے مات کھائیں؟ ان کے لیے دشمنانِ دین اور باغیانِ رب عظیم کی محاذ آرائی سے منہ موڑنے کا کوئی جواز نہیں، جب کہ ہمارے مولیٰ نے اہل ایمان کے لیے دنیا کی زندگی میں سربلندی وفتح مندی اور آخرت کی زندگی میں آسمان وزمین کی وسعت رکھنے والی جنت کی ان گنت نعمتوں کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا اس کے ثواب کی امید کے ساتھ کسل مندی کا کوئی معنی نہیں، اس کے وعدے پر یقین کے ساتھ کمزوری دکھانے کی کوئی گنجائش نہیں اور دنیا میں استقرار واستحکام بخشنے اور آخرت میں سرخروئی سے نوازنے کی دونوں بھرپور بھلائیوں کی ترغیب پیہم کے بعد، اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا مکمل استحقاق رکھنے والے گم کردۂ راہ کے مقابلے سے، جی چرانا چہ معنی دارد؟

ہم بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کرنے، قرآن میں ذکر کردہ اس کی عبرت خیز سچی داستان ہائے قوم وملل کو پڑھنے، تاریخ کے اشارات کو سمجھنے، الٰہی وعدہ اور وعیدوں کو احاطۂ فکر وتأمل میں لانے اور مجاہدین ومحسنین پر کیے گئے انعامات کو مستحضر رکھنے سے غافل رہتے ہیں، ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ پاک مجاہدین کی نصرت رعب کے ذریعے کرتا رہا ہے، تائیدِ غیبی سے انہیں تقویت دیتا رہا ہے اور کائنات کی ہر چیز میں پوشیدہ اپنے ’’سپاہیوں‘‘ کے ذریعے ان کی مدد کرتا رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کا ’’سپاہی‘‘ ہے، خاموش ہو یا گویا، جامد ہو یا بڑھنے والی، زندہ ہو یا مردہ، چھوٹی ہو یا بڑی، معمولی ہو یا غیر معمولی۔

ہاتھی والے ابرہہ اور اس کے فوجیوں کو اس خدائے ذوالجلال نے آخر پرندوں کی کنکریوں اور پتھروں کی بارش سے جس طرح تباہ کردیا تھا، رہتی دنیا تک کے لیے اس نے واقعے کو وحیِ متلو کی شکل میں زندہ پائندہ کردیا ہے، تاکہ دنیا والے ہمیشہ اس سے عبرت حاصل کرتے رہیں اور اگر توفیق ہو تو اس کے کھلے اور چھپے ’’سپاہیوں‘‘ سے خوف کھاتے رہیں، آئیے! ہمارے ساتھ آپ بھی اس چھوٹی سی سورۃ کی تلاوت کیجئے اور اپنے ایمان کو تازہ اور یقین کو صیقل اور رب کی بے حساب قدرت کا کچھ اندازہ کیجئے:

’’کیا تو نے دیکھا! کیا، کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ، کیا نہیں کردیا ان کا داؤ غلط اور بھیجے ان پر اڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں، پھینکتے تھے ان پر پتھریاں کنکر کی، پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس کھایا ہوا۔‘‘ (سورۂ فیل:۱ تا ۵، ترجمہ: شیخ الہندؒ)

اصحاب الفیل کا قصہ ذہن میں تازہ کرلیجئے ''حبشہ'' کی طرف سے ''یمن'' میں ایک حاکم ''ابرہہ'' نام کا تھا، اس نے دیکھا کہ سارے عرب کعبہ کا حج کرتے ہیں، تو اس کے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی کہ عرب والوں کو یہ سعادت حاصل ہے کہ لوگ اسی کے خطے میں ساری دنیا سے کھنچے چلے آتے ہیں، ایسا ہم عیسائیوں کے لیے کیوں نہیں؟ اس نے چاہا کہ لوگ کعبہ کو چھوڑ کر ہمارے پاس جمع ہوا کریں، اس کی تدبیر اس کے ذہن میں یہ آئی کہ اپنے عیسائی کے نام پر ایک عالی شان گرجا بنایا جائے، جس میں ہر طرح کے تکلفات اور راحت و دلکشی کے سامان ہوں، اس طرح لوگ اصلی اور سادہ کعبہ کو چھوڑ کر اس مکلّف اور مرصع ''کعبہ'' کی طرف آنے لگیں گے اور مکہ کا حج چھوٹ جائے گا، چنانچہ ''صنعاء'' جو یمن کا بڑا شہر ہے، اپنے مصنوعی کعبہ کی بنیاد رکھی اور خوب دل کھول کر روپے خرچ کیے، اس پر بھی لوگ ادھر متوجہ نہ ہوئے۔ عربوں کو خصوصاً قریش کو جب اس کی خبر ہوئی سخت ناراض ہوئے، کسی نے غصے میں آکر وہاں پاخانہ کردیا، ابرہہ چراغ پا ہوگیا، اس نے جھنجھلا کر کعبہ شریف پر فوج کشی کردی، بہت سا لشکر اور ہاتھی لے کر اس ارادے سے چلا کہ کعبہ کو منہدم کردے، اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب قریش کے سردار اور کعبہ کے متولی اعظم تھے، ان کو ابرہہ کے اس ارادے کی خبر ہوئی، تو اہل مکہ سے فرمایا: ''لوگو! اپنا بچاؤ کرلو، کعبہ جس کا گھر ہے، وہ خود اس کو بچالے گا۔'' ابرہہ نے راستہ صاف دیکھ کر یقین کرلیا کہ کعبہ کا منہدم کردینا کوئی مشکل کام نہیں، کیونکہ ادھر سے کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا، جب وادی ''محسر'' (جو مکہ کے قریب جگہ ہے) پہنچا تو سمندر کی طرف سے سبز اور زرد رنگ کے چھوٹے جانوروں کی ٹکڑیاں نظر آئیں، ہر ایک کی چونچ اور پنجوں میں چھوٹی کنکریاں تھیں، ان عجیب وغریب پرندوں کے غول کے غول کنکریاں لشکر پر برسانے لگے، خدا کی قدرت سے وہ کنکر کی پتھریاں بندوق کی گولی سے زیادہ کام کرتی تھیں، جس کے لگتیں، ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف کو نکل جاتیں اور ایک عجیب طرح کا سمی مادہ چھوڑ جاتی تھیں، بہت سے تو اپنی جگہ ہلاک ہوگئے، جو بھاگے وہ دوسری بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر مرے۔

مناجاتِ انبیاءؑ

قرآن کریم میں مذکور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقبول دعائیں

مولانا محمد عمر انور بدخشانی

(پہلی قسط)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب، برگزیدہ اور مستجاب الدعوات بندے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں سنتے اور قبول کرتے ہیں۔ لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء کرام علیہم السلام پر آتی ہیں۔ آزمائش کی گھڑیوں میں ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟ وہ اللہ کی طرف کیسی عاجزی کے ساتھ رجوع کرتے ہیں؟ ان کے دل سے کیا دعا نکلتی ہے؟ ان کا عزم اور یقین کس قدر مضبوط ہوتا ہے؟ سخت سے سخت امتحانات میں بھی ان کی تمام تر امیدیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے کس طرح وابستہ رہتی ہیں؟ وہ اپنی نگاہ اور توجہ ظاہری اسباب کے بجائے خالق اسباب کی طرف ہمیشہ کیسے مرکوز رکھتے ہیں؟ یہ سب کچھ ہمیں قرآن کریم بتاتا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِيْ الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ۔'' (الانبیاء:۹۰)

ترجمہ: ''یقیناً یہ لوگ (انبیاء) بھلائی کے کاموں میں تیزی دکھاتے تھے، اور ہمیں شوق اور رغبت کے عالم میں پکارا کرتے تھے، اور ان کے دل ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔''

عموماً لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو انبیاء کرام علیہم السلام تھے، اللہ تعالیٰ کے مقرب اور برگزیدہ بندے تھے، ان کی دعا تو لازمی سنی جائے گی اور قبول بھی ہوگی، جبکہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے عام بندے ہیں اور گناہ گار بھی ہیں، ہماری دعائیں کہاں اور کیسے قبول ہوں گی؟ اس طرح کی سوچ رکھنا درحقیقت یہ وسوسہ اور مایوسی ہے جو شیطان کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح اور صاف الفاظ میں اس وسوسہ اور مایوسی کو ختم کیا اور ارشاد فرمایا:

''وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔'' (البقرۃ:۱۸۶)

ترجمہ: ''اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو

(آپ ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔''

انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے مانگا جائے تو اس پر گراں گزرتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ سے اگر نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے، گویا عطائے خداوندی خود سائلوں کی تلاش میں رہتی ہے، اور گویا اس شعر کا مصداق ہوتی ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

اللہ تعالیٰ تو بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، البتہ دعا مانگنے کا طریقہ آنا چاہیے اور مذکورہ آیت کریمہ میں اس کی دو شرطیں بیان کی گئی ہیں:

۱- مانگنے والا میرا حکم ماننے والا ہو۔ ۲- اس کا ایمان اور یقین کامل ہو۔

ظاہر ہے کہ جب ہم کسی سے سوال کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر اس کی بڑائی، طاقت اور قدرت ضرور ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو سن رہا ہے اور وہ اس کو قبول بھی ضرور کرے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے:

''اللہ تعالیٰ اس درجہ باحیا اور کریم ہے کہ وہ کسی دعا کرنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا۔''

اس لیے ہمیشہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اگر ہماری مانگی گئی دعا فوراً قبول نہیں ہوئی تو یقیناً اس میں انسان کی بہتری ہوگی، کیونکہ انسان خود اپنی بھلائی کو جانچ نہیں سکتا۔ قرآن' خالق کا بندے سے ہم کلام ہونے کا نام ہے تو دعا بندے کا اپنے خالق سے ہم کلام ہونے کا نام ہے۔

اور یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہم جو دعا مانگیں وہ ہر حال میں قبول ہو، بلکہ احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی شرائط وآداب کو بجالاتے ہوئے مانگی ہوئی کوئی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاسکتی، بلکہ اللہ تعالیٰ وہ دعا کسی اور شکل میں ضرور قبول فرمالیتے ہیں، کیونکہ دعا کی قبولیت کی مختلف صورتیں ہیں:

۱- دعا کا فوراً قبول ہوجانا۔
۲- مطلوبہ دعا کا عرصہ بعد قبول ہونا۔
۳- مطلوبہ دعا کے بجائے اس سے بہتر صورت میں قبول ہوجانا۔
۴- آنے والی مصیبت کو دور کردیا جانا۔
۵- دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ کردیا جانا۔

ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بندے کی دعا ہمیشہ شرفِ قبولیت سے نوازی جاتی ہے، بشرطیکہ وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، اور جلدی نہ کرے۔ عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ وہ کہے میں نے تو بہت دعا کی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوگی، پھر وہ مایوس ہوکر دعا ترک ہی کردے۔'' (صحیح مسلم)

ذرا سوچیے! اللہ تعالیٰ کا کلام ہو اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعا ہو تو بھلا وہ کیونکر قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے محبوب بندوں - انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام - کی مقبول دعائیں ذکر کرکے گویا ہمیں خود مانگنے کے گُر سکھائے ہیں، یقیناً یہ تو عطا کرنے کے بہانے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اللہ کی رحمت کیا ہوگی کہ ہمیں یہ بھی سکھا دیا کہ کس طرح محبت بھرے عاجزانہ الفاظ و کیفیات میں اپنے رب کے سامنے دستِ سوال دراز کرو، یہ سب یقیناً اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کو نوازنا چاہتا ہے۔ جس وقت ہم دعا کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک ایسی لامتناہی قوت اور طاقت ور ذات سے جوڑ لیتے ہیں، جس نے اپنی قدرت سے فطرتاً ساری کائنات کی اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں کے الفاظ کی نقل میں دراصل وہ گوہر حاصل کرنا ہوتا ہے جو اِن برگزیدہ ہستیوں کے الفاظ میں پنہاں ہوتا ہے۔ اسی گوہر کے باعث وہی الفاظ دہرانے والے کی دعا شرفِ قبولیت حاصل کرلیتی ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کس طرح مشکلات میں اللہ تعالیٰ کو پکارا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد اور پکار کو سن کر کس طرح انہیں مشکلات سے نجات دی۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعائیں درحقیقت انسانوں کو سیدھا راستہ دکھانے اور مالک حقیقی کے ساتھ صحیح ربط قائم کرنے کے طریقہ کی تعلیم ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کو اپناتے ہوئے ہمیں بھی ان دعاؤں کو حفظ کرکے روزمرہ کی زندگی میں تلاوت اور پڑھتے رہنا چاہیے۔ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے منقول دعاؤں پر ایک نظر ڈالی جائے اور ان کی مختصر تشریح پیش کی جائے۔

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی طلب مغفرت ورحمت کی دعا

''رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۔'' (الاعراف:۲۳)

''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کرگزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہوجائیں گے۔''

تشریح: حضرت آدم اور حوّا علیہما السلام نے - جب ان سے ایک لغزش ہوگئی تھی تو - معافی چاہنے کے لیے یہ دعا مانگی تھی، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ہی سکھائی تھی، اور ان کلمات کی وجہ سے وہ دعا جلدی سے قبول بھی ہوگئی۔

اعترافِ قصور

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو جیسے ہی تنبہ ہوا تو بے ساختہ ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو غلطی کے شدید احساس کے بعد طاری ہوتی ہے اور فوراً اپنے رب کو پکارتے ہوئے کہا کہ: اے ہمارے رب! ہم کوئی عذر پیش نہیں کرتے کہ ہم سے یہ غلطی کیوں سرزد ہوئی، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے یہ حرکت کرکے آپ کی شان میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ اپنے نفس کا نقصان کیا۔ ہم نے غلطی کرکے اپنے آپ پر ظلم کیا، اب ہم اپنی اس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ہی سے دست بستہ پوری عاجزی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ آپ ہماری اس غلطی کو معاف فرمادیں۔ ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں، آپ ہم پر رحم فرمائیں اور ہمارے گناہ کو معاف فرمادیں، اس لیے کہ آپ نے اگر ہمیں معاف نہ فرمایا تو پھر ہماری نامرادی اور خسارے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے رویے میں امتیازی فرق

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ گناہ شیطان سے بھی ہوا، جب اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا، لیکن اس نے بجائے عجز واعتراف کے انکار و بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوگیا۔ اور لغزش حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے بھی ہوئی، لیکن وہ فوراً اللہ کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ جھک گئے۔ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا طرز و انداز ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے اندر کبھی بغاوت وسرکشی کی جرأت پیدا نہ ہونے دیں، یہ ابلیس کا رویہ ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی کوئی غلطی ہوجائے یا معصیت کے راستے پر چل پڑیں تو تنبہ ہوجانے کے بعد فوراً توبہ کا راستہ اختیار کریں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کرنے کے لیے یہ الفاظ نہایت مناسب ہیں اور ان کے ذریعے توبہ قبول ہونے کی زیادہ امید ہے، کیونکہ یہ الفاظ خود اللہ تعالیٰ ہی کے سکھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ایک طرف شیطان کو مہلت دے کر اسے انسان کو بہکانے کی صلاحیت دی ہے جو اپنے اثر کے اعتبار سے انسان کے لیے زہر جیسی تھی تو دوسری طرف علاج کے طور پر انسان کو توبہ اور استغفار کا تریاق بھی عطا فرمادیا کہ اگر شیطان کے بہکاوے میں آکر وہ کبھی کوئی گناہ کر گزرے تو اُسے فوراً توبہ کرنی چاہیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، اس طرح شیطان کا چڑھایا ہوا زہر اتر جائے گا۔ (آسان ترجمہ قرآن)

جو شخص بھی اس آیت کو ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگے تو ان شاء اللہ تعالیٰ! اس کے گناہ معاف کردیے جائیں گے، کیونکہ یہ دعا حضرت آدم علیہ السلام کی ہے اور مقبول بھی ہوچکی ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

(جاری ہے)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی خدمات

(دوسری قسط)

مفتی محمد رضا انصاری

مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ علمائے احناف کے احوال مرتب کرنے کا بیڑا اُٹھالیا تھا، لیکن ایک سوال ان کے سامنے یہ آ گیا:

''اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے لے کر اپنے زمانے تک کے تمام علمائے احناف کے حالات کو عہد بہ عہد ایک کتاب میں جمع کر دیتا ہوں تو وہ اتنی ضخیم ہو جائے گی کہ اس سے سوائے خاص خاص لوگوں کے اور کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا، تو میں نے یہ پسند کیا کہ ایک ضخیم کتاب میں علمائے احناف کے احوال کو جمع کرنے کے بجائے متعدد کتابوں اور الگ الگ رسالوں میں ان کو بانٹ دوں، تاکہ ان سے نفع اٹھانا مشکل نہ رہے۔''①

پھر اسی تجویز کردہ پروگرام کے مطابق مولانا نے علمائے احناف اور مصنفین کے احوال وتراجم کو الگ الگ کتابوں میں بانٹ کر مرتب کرنا شروع کر دیا، فقہ حنفی کی معتبر اور متداول کتاب ہدایہ پر انہوں نے مقدمۃ الہدایہ اور مذیلۃ الدرایہ دو مختلف مقدمے لکھے اور ان میں ان تمام اشخاص وافراد کے حالات جمع کر دیئے جن کا کسی نہ کسی عنوان سے اصل کتاب میں ذکر آیا ہے، انہوں نے فقہ حنفی کی قدیم ترین کتاب ''**الجامع الصغیر**'' پر ایک مبسوط مقدمہ ''**النافع الکبیر من یطالع الجامع الصغیر**'' کے نام سے لکھا اور اس میں جامع صغیر کے تمام شارحین کا فقہ حنفی کے تمام مشہور متنوں کے مصنفین کا، حنفی فقہ کی متداول اور مروج کتابوں کا اور ان میں معتبر اور نامعتبر کی تعیین کا، فقہائے احناف کے طبقات کا اور عہد رسالت ﷺ سے لے کر مجتہدین کے عہد تک فقہ کے ارتقاء کا، اس طرح فقہ حنفی کی تاریخ کا مفصل ذکر کر دیا، پھر فقہ حنفی کی رائج کتاب شرح وقایہ کی طرف انہوں نے توجہ کی اور ''**عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ**'' کے نام سے موسوم اپنے حاشیہ کے مقدمے میں نہ صرف شرح وقایہ میں مذکور اشخاص، علماء ومصنفین، صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ اور علمائے احناف وشوافع وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا، بلکہ جن جن حضرات نے شرح وقایہ کی پوری کتاب یا اس کے بعض مباحث پر حواشی لکھے، اصل متن وقایہ کی جن دوسرے حضرات نے

شرحیں لکھیں، دوسرے مشہور متن نقایہ کی جن جن حضرات نے شرحیں لکھیں ان سب کے احوال کو اس میں جمع کر دیا اور اس ضمن میں فقہ حنفی کے تدریجی ارتقاء اور فقہائے احناف کے طبقات کا بھی مفصل ذکر اس مقدمہ میں اس طرح کیا کہ ان مباحث پر مقدمۂ جامع صغیر میں جو کچھ لکھ چکے تھے، اس پر بہت مفید اضافے کیے، پھر شرح وقایہ کی جو مفصل شرح ''السعاية في كشف ما في شرح الوقاية'' لکھنا شروع کی، جو علمی دنیا کی بدقسمتی سے مکمل نہ ہوسکی، اس کے مقدمے میں اسی معیار کے مطابق انہوں نے مفید اضافوں کے ساتھ انہیں مباحث پر مزید روشنی ڈالی جو مقدمہ ''عمدة الرعاية'' میں کر چکے تھے، پھر جب حدیث کی مشہور اور قدیم ترین کتاب مؤطا امام مالک بروایۃ امام محمدؒ پر جس کو مؤطا امام محمدؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مولانا نے ایک تفصیلی اور تحقیقی حاشیہ ''التعليق الممجد'' کے نام سے لکھا تو اس کے مقدمے میں بھی بڑی شرح وبسط کے ساتھ فن حدیث کے ارتقاء کی تاریخ بڑے بڑے محدثین اور مؤطا امام مالکؒ کے خاص خاص راویین، مؤطا کے شارحین اور اس کے مختلف نسخوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔

یہ مقدماتِ کتب اگرچہ اصل کتب کے ضمن میں شائع ہوئے، لیکن بلاشبہ وہ مستقل تاریخی تصانیف ہیں، خود مولانا نے جہاں اپنی تصانیف کی فن وار تفصیل وتعداد بیان کی ہے وہاں مقدمہ ''التعليق الممجد'' اور مقدمہ ''عمدة الرعاية'' کے بارے میں صاف طور پر اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

''اگرچہ یہ دونوں مقدمے اصل کتابوں کے ضمن میں شائع ہوئے ہیں، لیکن یہ مستقل تصانیف کے مانند ہیں اس لیے ان کو مستقل اور جداگانہ تصنیف قرار دینا ہی حق بجانب ہے۔''②

ان دونوں مقدمات کو نیز اسی طرح کے دوسرے مقدمات کو جن کے نام اوپر گزر چکے ہیں، مستقل تصانیف مانا جائے خواہ ضمنی، مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کی تذکرہ نگاری کی حیثیت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ تاریخ وتذکرہ کے موضوع پر ان کی مستقل بالذات تصانیف بھی موجود ہیں جن میں سے بعض طبع ہوچکی ہیں، بعض مخطوطے کی شکل میں ہیں اور بعض مفقود۔ تذکرہ وتاریخ پر ان کی مستقل بالذات تصانیف کو ہم نے تاریخی خدمات کا دوسرا پہلو قرار دیا ہے۔

اس دوسرے پہلو کی طرف بھی مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے ایک وسیع پروگرام بنا کر توجہ کی اور تن تنہا اس وسیع پروگرام کو انہوں نے قریب قریب پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فقہ وحدیث کی مہتم بالشان کتابوں کو ایڈٹ کرتے اور ان پر جامع ومبسوط مقدمات قلم بند کرتے ہوئے بہت بڑی تعداد میں علمائے احناف وغیر احناف نیز محدثین ورواۃ کے احوال انہوں نے صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیے تھے، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ان کی متعدد کتابوں میں بکھری ہوئی تھی اور یہ ضرورت پھر بھی باقی تھی کہ شروع سے لے کر اپنے عہد تک کے تمام قابل ذکر علماء ومصنفین کے احوال کسی ایسی ترتیب کے ساتھ مرتب ہو جائیں کہ ان کا تلاش کر لینا آسان ہو، مولانا نے پروگرام اس طرح بنایا کہ اپنی صدی سے ایک صدی قبل تک یعنی بارہویں صدی ہجری تک کے علماء ومصنفین کے حالات پہلے قلم بند ہو جائیں، اس کے بعد اپنی صدی کے

علماء کے تذکرے اسی نقشے کے مطابق انہوں نے اپنے کام کا آغاز کردیا، مولانا کے بیان کے مطابق:

''میں عنفوانِ شباب ہی سے محترم علماء کے احوال معلوم کرنے کا شائق رہا اور احوالِ علماء اور حوادثِ تاریخ کی نہ معلوم کتنی کتابیں میں نے مطالعہ کر ڈالیں، یہاں تک کہ اس موضوع پر مجھے کافی معلومات نصیب ہوگئے جن میں سے بیشتر حصے کو میں نے جمع کرلیا اور ارادہ کرلیا کہ اپنے جمع کیے ہوئے ذخیرے کو ایک ایسے مجموعے کی شکل میں سامنے لاؤں کہ وہ تمام معلومات کا جامع ہو۔'' ③

اسی خیال کو عملی جامع پہنانے کے دوران ہی ان کو کفوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات: ۱۵۸۲ء-۹۹۰ھ) کی مشہور کتاب ''کتائب أعلام الأخیار'' مل گئی جو ''طبقاتِ کفوی'' کہلاتی ہے، مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں طبقات وتراجم کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ثابت ہوئی، اس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر کفوی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد تک (دسویں صدی ہجری کے آخر تک) کے علماء، ان کے سلاسلِ تلمذ، ولادت، وفات اور تصانیف کا ذکر ایک ترتیب کے ساتھ تھا۔ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبقات کفویؒ'' کو اپنے مطلوب ومقصود کے عین مطابق پایا، کفوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات: ۱۵۸۲ء-۹۹۰ھ) نے اپنی کتاب ''کتائب أعلام الأخیار'' کے ہر ''کتیبے'' یا ہر باب میں علماء اور مصنفین کے علاوہ صوفیاء اور اولیاء کا بھی ذکر کیا ہے۔ مولانا نے اس کتاب سے ان اجزاء کو جو علماء اور مصنفین کے احوال سے متعلق تھے اختصار کے ساتھ نقل کرلیا اور پہلے سے جو مواد اس سلسلے میں اکٹھا کر چکے تھے اس کو شامل کر کے پوری ایک کتاب ترتیب دے دی جس کا نام ''الفوائدالبهية في تراجم الحنفية'' رکھا۔

مولانا نے صوفیاء اور صالحین کے احوال کو طبقات کفویؒ سے اس لیے نہیں لیا کہ:

''ان کی -صوفیاء اور اولیاء کے- احوال میں بکثرت تصانیف ہیں اور ان سے متعلق خبریں اور روایتیں کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔'' ④

انہوں نے اپنی کتاب کی ترتیب اس طرح رکھی کہ ''طبقات کفویؒ'' کے مطالب کو اختصار کے ساتھ نقل کرنے کے بعد، دوسرے ذرائع سے اخذ کردہ مواد کو ''قال الجامع'' کے تحت اسی کے آگے درج کردیا، اس ضمن میں ''موالید ووفیات'' کے بارے میں مؤرخین کے اختلافات پر بھی روشنی ڈالی، خود کفویؒ (وفات: ۱۵۸۲ء-۹۹۰ھ) سے تصانیف کے انتساب میں جو بھول چوک ہوگئی تھی اس کی بھی تصحیح کردی۔ متقدمین کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کے بارے میں جو فیصلہ کن بات مولانا کے خیال میں ہوسکتی تھی اس کی بھی وضاحت کرتے گئے اور انساب کی کتابوں سے اخذ کر کے فقہاء وعلماء کے نسبوں کو بھی تفصیل سے درج کردیا اور یہاں تک اس تصنیف کو انہوں نے مفید بنانے کی کوشش کی کہ جو اختلافی مسائل تذکروں کے ضمن میں ذکر ہوئے تھے ان کی تحقیق اور ان کے دلائل بھی نکتہ رسی کے ساتھ درج کردیئے۔

اس سلسلے میں جو سب سے اہم خدمت مولانا سے انجام پا گئی، وہ یہ کہ مصنفین کے احوال میں ان کی تصانیف کو گناتے ہوئے مولانا یہ بھی بتاتے گئے کہ خود انہوں نے ان میں سے کون کون سی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی نظر میں مطالعہ کی ہوئی تصانیف کا کیا درجہ ہے، گو بہت مختصر الفاظ میں یہ رائے زنی انہوں نے کی ہے، مگر انتہائی جچے تلے انداز میں کی ہے۔

''**الفوائد البهية فی تراجم الحنفية**''، کم وبیش چھ سو علماء ومصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے، اوران تراجم میں برسبیل تذکرہ جن جن مشہور شخصیتوں کا حوالہ آ گیا ان کے مختصر احوال اصلی کتاب کے حاشیہ پر وہ درج کرتے گئے، ان حواشی کا نام ''**التعلیقات السنیة علی الفوائد البهیة**'' رکھا، اس طرح ڈیڑھ سو سے زیادہ مزید تراجم کا اضافہ اصل کتاب پر ہو گیا، مثال کے طور پر مشہور مصنف میر سید شریف جرجانیؒ کا تذکرہ ''**الفوائد البهیة**'' میں دیکھیے جو اصل کتاب کے صفحہ:۵۲ پر ہے۔ میر سید شریف جرجانیؒ کے ذکر میں علامہ قطب الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اس بنا پر آ گیا کہ میر صاحبؒ پہلے ان ہی کی خدمت میں علوم عقلیہ کی تحصیل کے لیے حاضر ہوئے تھے، میر جرجانیؒ کے دو شرکائے درس محمود بن اسرائیلؒ جو ابن قاضی سماوہؒ کے نام سے مشہور ہیں اور تسہیل کے مصنف الحاج پاشا کا بھی ذکر آ گیا، ان ہی میر جرجانیؒ کے احوال میں تیمور لنگ کا بھی ذکر آیا اور دربارِ تیموری میں میر صاحبؒ کے حریف علامہ سعد الدین تفتازانیؒ کا حوالہ بھی اور اس مناظرہ کا ذکر بھی جو ان دونوں حریفوں کے درمیان ''استعادہ'' کے موضوع پر ہوا تھا، اس مناظرے کے حَکَم نعمان الدین خوارزمیؒ کا ذکر بھی مناظرے کے ذکر میں آنا ضروری تھا وہ بھی آیا، میر سید شریف جرجانیؒ کے روحانی پیشوا اور مرشد خواجہ علاء الدین العطار بخاریؒ کا بھی ذکر ضروری تھا، وہ بھی ضمناً آیا۔ ان اشخاص کا کفوی نے برسبیل تذکرہ حوالہ دیا تھا، مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ضمناً مذکور ان تمام حضرات کے حالات حاشیہ پر ثبت کر دیئے، یہی نہیں بلکہ قطب الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں نام ولقب میں ان کے شریک اور نسبت ونسب میں مختلف علامہ قطب الدین شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی ان کے ساتھ لکھ دیئے اور ان دونوں نامور مصنفوں کی جو جو تصانیف مولانا کی نظر سے گزری تھیں ان کا بھی ذکر کیا۔ ان دونوں مصنفین یعنی قطب رازیؒ اور قطب شیرازیؒ کے احوال کے سلسلے میں دوسرے مورخین سے جو غلط فہمیاں درج کتب ہو گئی تھیں، ان کی بھی حاشیہ میں مولانا نے تصحیح کر دی، جیسے ''**حبیب السیر**'' کے مصنف کو غلط فہمی تھی کہ قطب الدین شیرازیؒ دو ہیں، ایک وہ جنہوں نے ''قانون شیخ'' کی شرح لکھی اور جو علامہ طوسی کے شاگرد تھے، دوسرے وہ جنہوں نے ''**حکمة الإشراق**'' اور ''**مفتاح**'' وغیرہ کی لکھی، اور اسی غلط فہمی میں ''شرح چغمینی'' کے محشی ملا محمد معصوم بلخی بھی مبتلا ہوئے، مولانا نے حاشیہ میں وضاحت کر دی کہ یہ غلط گمان ان دونوں کو ہوا، ''قانون'' اور ''حکمۃ الاشراق'' دونوں کے شارح دو الگ الگ شخص نہیں، بلکہ ایک ہی صاحب ہیں۔

جرجانی کے شرکائے درس ابن قاضی سماوہؒ اور صاحب التسہیل کے حالات بھی حاشیہ پر مولانا نے

درج کیے اور ایک اور شریکِ درس مولی احمدی کا بھی ذکر حاشیہ میں کیا، جن کو کفویؒ (۱۵۸۲ء-۹۹۰ھ) نظر انداز کر گئے تھے۔ تیمور لنگ کا بھی احوال مولانا نے حاشیہ پر ثبت کیا، اس کے احوال میں جن کتابوں کا حوالہ مولانا نے دیا، ان میں سے ایک کتاب ''عجائب المقدور في أخبار تیمور'' بھی ہے۔ مولانا نے اس کتاب کی تعریف کی ہے کہ وہ دلچسپ اور نادر کتاب ہے اور تیمور لنگ کے مفصل حالات اس میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ''فتح المتعال في مدح خير النعال''، ''أخبار الأول''، ''روضة المناظر في أخبار الأوائل والأواخر'' اور ''حبيب السير'' وغیرہ کتابوں کا بھی حوالہ اس سلسلے میں انہوں نے دیا ہے۔

دربار تیموری میں جرجانیؒ اور تفتازانیؒ کے درمیان ہونے والے مناظرے کے حکم نعمان الدین خوارزمیؒ کا احوال بھی ''عجائب المقدور'' اور ''روضة المناظر'' کے حوالوں سے حاشیہ میں لکھا اور اسی ضمن میں اس حاضر جوابی کا نادر الوقوع واقعہ بھی مولانا نے مجملاً درج کر دیا ہے جس نے ظالم اور سنگدل تیمور کے غیظ وغضب سے ہزاروں علماء کو ہمیشہ کے لیے بچا لیا۔ ⑤

علامہ تفتازانیؒ کا احوال، ان کی تصانیف کی تفصیل، میر سید شریف جرجانیؒ کے پیر و مرشد خواجہ علاء الدین العطار بخاریؒ کا احوال اور میر جرجانیؒ کے صحیح نام کی تحقیق وغیرہ یہ سب امور مولانا نے حاشیہ میں بیان کر دیئے۔ ''الفوائد البهية'' کی تاریخی اہمیت اور اس کے مصنف مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی مورخانہ بصیرت کا اندازہ کرنے کے لیے میر سید شریف جرجانیؒ کا تذکرہ کافی ہے، کفویؒ نے طبقات میں جرجانیؒ کے احوال میں کچھ لکھا تھا، اس کا اختصار مولانا نے ۱۸ سطروں میں کیا ہے، پھر ''قال الجامع'' کے تحت مولانا نے مزید معلومات ۷۹ رسطروں میں متن میں درج کیے ہیں اور ۱۵ رحواشی لکھے ہیں جن کو اگر متن کی سطروں میں شمار کیا جائے تو مزید پچاس سطریں ہو جائیں گی، اس طرح کفویؒ کے پیش کردہ مواد پر مولانا نے کئی گنا اضافہ کیا اور صرف ان سوا سو سطروں کے سلسلے میں جن کتابوں کے حوالے انہوں نے دیئے ہیں، ان کی تعداد بھی حیرت انگیز ہے، یعنی ۳۰ تو صرف وہ کتابیں ہیں جن سے مولانا نے مواد کی فراہمی میں کام لیا ہے اور ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی ان کے علاوہ ہے جن کے بارے میں ان چند سطروں کے درمیان مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں مولانا کے حالات وسوانح پر کام کرنے والا حیرت زدہ بلکہ دہشت زدہ ہو جاتا ہے، بقول مفتی عبدالفتاح ابوغدہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ:

> ''امام لکھنوی (مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ) کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کا مصنف کیسی اعلیٰ علمی تحقیق اور کہاں کہاں سے اقتباسات پیش کرتا ہے، جس مسئلے یا موضوع پر لکھتا ہے تو ایسی جامعیت کے ساتھ لکھتا ہے کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس مصنف نے عمر بھر صرف اسی ایک موضوع پر تحقیق کی ہے اور کوئی دوسرا موضوع چھوا بھی

نہیں ہے۔ مولانا کی اتنی کثیر تصانیف میں آپ یہ کہیں نہیں پائیں گے کہ انہوں نے اپنی کہی کسی بات کو کہیں بھی دہرایا ہو، اور اپنی معلومات کو مکرر سہ کرر پیش کیا ہو۔'' ⑥

اس مہتم بالشان تصنیف پر مولانا نے کتنا وقت صرف کیا، اس کا صحیح علم ہو جانے پر حیرت اور بڑھ جاتی ہے، انہوں نے طبقات کفویؒ سے تراجم واحوال کے اخذ کرنے میں صرف ایک مہینہ صرف کیا (جمادی الثانیۃ ۱۲۹۱ھ) اس وقت وہ اپنے وطن لکھنؤ میں مقیم تھے اور ماخوذ مواد پر مولانا نے جو گراں قدر اضافے ''الفوائد البھیۃ'' کے متن میں کیے ان میں صرف چار ماہ صرف کیے، اس وقت وہ حیدر آباد میں مقیم تھے، اس طرح اس شاندار علمی خدمت سے وہ پانچ ماہ میں فارغ ہو گئے ⑦۔ اور اس کے حواشی ''التعلیقات السنیۃ'' کی تحریر سے اس کے ایک سال کے بعد فرصت پائی ⑧۔ تعلیقات لکھنے کا آغاز کب کیا تھا؟ اس کی وضاحت نہیں ملتی، یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ اس تصنیف اور اس کی تعلیقات کی تالیف کے دوران پانچ ماہ مولانا نے سفر حج وزیارت میں صرف کیے، اس طرح جمادی الثانیہ ۱۲۹۳ھ میں تعلیقات پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ یہی نہیں کہ ان محدود دے چند مہینوں میں مولانا اسی ایک تصنیف میں مصروف رہے ہوں، ان کی اپنی ہی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ ایک ساتھ کئی کئی موضوعات پر جو باہم بالکل متضاد ہوا کرتے تھے، اہم تصانیف کرنے میں لگے ہوتے تھے، اسی ''التعلیقات السنیۃ'' کی تالیف کے دوران مولانا اصول حدیث کی اپنی مشہور تالیف میں بھی مصروف تھے جو ''ظفر الأمانی'' کے نام سے مشہور ہے۔ ⑨ اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں بھی اسی دوران زیر تصنیف تھیں۔

اس مضمون کی تحریر کے وقت ''الفوائد البھیۃ'' کا تیسرا ایڈیشن پیش نظر ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد ان کے داماد مفتی محمد یوسفؒ نے اپنے مطبع یوسفی پریس لکھنؤ سے ۱۸۹۵ء میں شائع کیا تھا، یہ بڑے سائز یعنی ۱۲/۱ انچ اور ۸/۱ انچ لمبے چوڑے صفحے کے ۹۸ صفحات کی ہے، ٹائیٹل اور فہرست مضامین کے چھ صفحے جوڑنے کے بعد مجموعی تعدادِ صفحات ایک سو چار ہو جاتی ہے، ہر صفحے پر ۳۱ سطریں صرف متن کی ہیں، حواشی اس کے علاوہ ہیں۔

اس کتاب کو اگر اس طرح چھاپا جائے جس طرح دائرۃ المعارف (حیدر آباد) کی مطبوعات ہیں یا جس طرح آج کل مشرق وسطیٰ کی عربی مطبوعات چھاپی جا رہی ہیں تو بلا شبہ متن اور حواشی سمیت ۹۸ صفحات پر پھیلا ہوا مواد ایک ہزار صفحات پر آئے گا، زیر نظر ایڈیشن کی کتابت بھی باریک ہے اور خط بھی نستعلیق ہے جو نسخ یا ٹائپ کے اعتبار سے بہت کم جگہ لیتا ہے۔ حواشی ''التعلیقات السنیۃ'' کا نستعلیق خط اس قدر باریک ہے کہ ادھیڑ عمر والوں کو اس کا پڑھنا بھی آسان نہیں ہے۔

مولانا کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی حیات میں اور اس کے بعد بار بار ہندوستان میں چھپی، مصر میں بھی اس کی قدر کی گئی اور وہاں بھی بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اسے چھاپا گیا اور ابھی تین

چار سال ہوئے بنارس کے ایک ناشر نے اسے پھر شائع کیا ہے، اس لیے کہ بازاروں میں مل نہیں رہی تھی۔

آج بھی جب کہ تاریخی تحقیقات بہت دور تک جا چکی ہیں، علمی دنیا ''الفوائد البھیة'' سے مستغنی نہیں ہوسکی ہے، مشرق وسطیٰ خاص کر مصر میں آج بھی فقہ اور ارباب فقہ کے سلسلے میں جو تحقیقی کام ہورہے ہیں اور کتابی شکل میں یہاں پہنچ رہے ہیں، ان میں سے مشکل ہی سے کوئی ایسا کام ہوگا جو ''الفوائد البھیة'' کے حوالے سے خالی ہو، ابوزہرہؒ ہوں یا عبدالقادر حسن، عبدالعزیز عامر ہوں یا یوسف موسیٰ یا ڈاکٹر صبحی محمصانی، مشرق وسطیٰ کے ان نامور محققین کی تصانیف اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ''الفوائد البھیة'' اور اس کی تعلیقات کی تالیف سے جب مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فارغ ہوئے، اس وقت ان کی عمر صرف ۲۸ سال ۷ ماہ تھی۔

حواشی وحوالہ جات

①......الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ص:۸-۹، تیسرا ایڈیشن، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ، ۱۸۹۵ء

②......مقدمۃ عمدۃ الرعایۃ، ص:۳۰، مطبوعہ اصح المطابع واقع لکھنؤ، ۱۳۰۷ھ

③......الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ص:۸، تیسرا ایڈیشن، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ، ۱۸۹۵ء

④......ایضاً، ص:۹۔

⑤......اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، مذکورہ مناظرے کے حَکَم نعمان الدین خوارزمی کے بیٹے عبدالجبار' تیمور کے ساتھ تھے، جب وہ فتوحات کرتا ہوا حلب میں داخل ہوا، فاتح حلب کے پاس شہر کے علماء اور قضاۃ حاضر ہوئے، بادشاہ نے ترجمان کے ذریعہ-اور ترجمان یہی مولیٰ عبدالجبار بن نعمان خوارزمی تھے- علماء وقضاۃ سے سوال کیا- یہی سوال وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سمرقند، بخارا اور ہرات کے علماء سے بھی کرچکا تھا اور حسب مرضی جواب نہ ملنے پر ان علماء پر ظلم وستم کرچکا تھا بعضوں کو قتل تک بھی- یہ بتاؤ کہ ہماری فوج اور مفتوحہ فوج کے مقابلے میں ادھر سے بھی لوگ قتل ہوئے ادھر سے بھی، دونوں طرف کے مرنے والوں میں، شہید کس طرف کے لوگ ہیں؟ قاضی شرف الدین الانصاری شافعیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا برجستہ جواب القاء فرمادیا اور میں نے عرض کیا کہ یہی سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی پوچھا گیا تھا اور آپ نے جو جواب دیا تھا، وہی میں بھی جواب دیتا ہوں، تیمور ہمہ تن گوش ہوکر مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا اور مولیٰ عبدالجبار نے گویا میرا مضحکہ کرتے ہوئے پوچھا ''اچھا! تو وہ جواب فرمایئے'' میں نے کہا: ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص بہادری اور جذبے سے اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا نام ومرتبہ لوگ جان جائیں تو راہِ خدا میں لڑنے والا مانا جائے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو وہی اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے، اس کے بعد میں نے تیمور سے کہا کہ ''ہماری طرف سے اور تمہاری طرف سے قتل ہونے والوں میں شہید ہر وہ آدمی ہے جو اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے لڑا'' تیمور بولا: ''خوب! خوب!'' اور مولیٰ عبدالجبار نے کہا: ''کیا عمدہ جواب آپ نے دیا ہے۔''

⑥......مقدمہ الاجوبۃ الفاضلۃ، ص:۱۴، مطبوعہ حلب (شام) ۱۹۶۴ء

⑦......الفوائد البہیۃ، ص:۹

⑧......التعلیقات السنیۃ علی الفوائد البہیۃ، ص:۱۰۴، مطبوعہ یوسفی پریس، تیسرا ایڈیشن، ص:۱۸۸۵ء

⑨......ایضاً

(جاری ہے)

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ

معزز مہمانانِ گرامی اور میرے عزیز طلبہ!

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خوشی کے موقع پر بھی تعلیمات دی ہیں کہ ہم کس طرح خوشی منائیں، ہم خوشی منانے میں بھی آزاد نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اس دنیا میں آزمائشیں آتی ہیں، بیماریاں آتی ہیں، نقصان ہوتے ہیں، وفات ہوتی ہیں، یہ بھی مصائب ہیں، اب اس میں ہمیں کیا کرنا ہے؟ عملی طور پر بالکل واضح تعلیمات دی ہیں، اقوال سے بھی، اعمال سے بھی۔ دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مصیبتیں آئی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی قریب ترین بعض حضرات جدا ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ تو امت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نمونہ پیش کیا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کا ایک چھوٹا بچہ آخری حالت میں تھا، انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں، تاکہ ان کو تسلی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان سے جاکے سلام کہو اور ان سے کہو کہ وہ صبر کریں اور اجر وثواب کی دل میں نیت رکھیں، لیکن ماں ماں ہوتی ہے، انہوں نے دوبارہ آدمی بھیجا اور قسم دی کہ آپ ضرور تشریف لائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ صحابہؓ تشریف لے گئے، بچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں لایا گیا، اس کے بالکل آخری سانس تھے، اس کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو بہنے لگے، ایک صحابیؓ نے تعجب سے پوچھا: حضرت! آپ بھی روتے ہیں؟ فرمایا کہ: یہ تو رحمت کی علامت ہے جو اللہ نے دلوں میں رکھی ہے۔'' اللہ تعالیٰ جو روکتا ہے یعنی ناپسند کرتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی طرف اشارہ فرمایا یعنی کوئی بین کرے، یا ایسی ایسی باتیں کرے جس میں نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ سے شکوہ شکایت ہو یا گریبان پھاڑے، منہ پر مارے، یہ چیزیں منع ہیں۔ محض رونا، غم کا اظہار کرنا منع نہیں ہے، یہ تو رحمت کی علامت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں لایا گیا، وہ بھی اسی آخری حالت میں تھے، بلکہ فوت ہوچکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو مبارک بہہ رہے تھے، فرمایا کہ: ''**العین تدمع والقلب یحزن وإنا بفراقک یا إبراھیم! لمحزونون ولانقول إلا مایرضی بہ ربنا**

سبحانہٗ وتعالیٰ۔''......آنکھیں پرنم ہیں، دل غمگین ہے، اور اے ابراہیم! تمہاری جدائی پر ہم غمگین ہیں، ہمیں غم ہے، ہمیں صدمہ ہے، لیکن اپنی زبان سے ہم وہی بات کریں گے جو اللہ کو پسند ہوگی، اپنی زبان سے ایسی باتیں نہیں کریں گے جس میں شکوہ شکایت ہو۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نظام رکھا ہے، بہرحال انسان انسان ہے، اور اس میں ایک دل ہے، جدائی پہ انسان کو تکلیف ہوتی ہے، بے شک ہوتی ہے، اسلام نے اس سے منع نہیں کیا، اسلام اس سے منع کرتا ہے کہ آپے سے باہر ہوکر- جیسے جاہلیت میں تھا کہ- مکے مار رہے ہیں، گریبان پھاڑ رہے ہیں، اور بین کررہے ہیں اور شکوے شکایتیں ہورہی ہیں، اس سے منع کیا ہے، بہرحال آج جس مرحومہ کے لیے آپ نے قرآن کریم پڑھا ہے، اور ہم جمع ہوئے ہیں، انسان جب زندہ ہوتا ہے تو اس کے حقوق ہوتے ہیں، ماں باپ ہیں، بہن بھائی ہیں، عزیز واقارب ہیں، اور ایک ہے دنیا سے جانے کے بعد پھر بھی حقوق ختم نہیں ہوتے۔

ہمارا مرحومہ سے ایک روحانی تعلق تھا، اور میرا ذاتی طور پر تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے بہت زیادہ تعلق تھا، ایسا تعلق جیسے بہن بھائیوں جیسا، اس لیے کہ یہ مرحومہ اور ان کی دوسری بہنیں، اور محمد مرحوم یہ بچے تھے، جب حضرتؒ (حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ) یہاں تشریف لائے، یہاں پہلے مکان نہیں تھا، دو مکان بنے، ایک امام صاحب کے لیے اور ایک مدرسہ کے مہتمم کے لیے، جب حضرتؒ تشریف لائے تو یہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے، تو اب گھر کے چھوٹے چھوٹے کام میں بجالاتا تھا، اور ان کی زبانوں پر یہ چڑھ گیا کہ یہ مجھے بابو بھائی کہتے تھے، جب بھی مجھے بلاتے تو کہتے بابو بھائی کو بلالو، یہ چھوٹے چھوٹے میرے سامنے بڑے ہوئے، اس لیے حضرتؒ کی وجہ سے میرا یہ تعلق تھا۔ ابھی تک مجھے یاد ہے آخری جو ہماری ٹیلیفون پر بات ہوئی، ٹیلیفون آیا، میں نے اٹھایا- اور گھر پہ بچوں کے ساتھ ان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں- کہا کہ آپ کون؟ میں نے کہا: آپ کا بابو بھائی بول رہا ہوں، بہت خوش ہوئیں، بہرحال پھر میں نے بچوں کو دے دیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے ہمارا ایک روحانی تعلق تھا، یہ سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، تو وہ اُسے تکلیفوں میں مبتلا کردیتے ہیں، بعض دفعہ یہ بیماری خود ایک علاج ہے، اور اس سے صفائی ہوتی ہے۔

پاک صاف ہوکر ایک بندہ اللہ کے ہاں پہنچ جاتا ہے، مرحومہ ایک عرصہ سے بستر پر تھیں اور اس بیماری سے اللہ نے انہیں پاک صاف کردیا، تو آج اگر وہ ٹھیک ہے کہ ہم سے جدا ہوگئیں، ہم قریب بعید جتنے بھی ہیں، ہمیں صدمہ ہے: ''**العین تدمع والقلب یحزن وإنا بفراقک یا أختنا لمحزونون۔**''

لیکن اگر غور کریں تو ان شاء اللہ! اللہ سے یہی امید ہے کہ وہ خوش ہوں گی، آج وہ خوشی میں ہوں گی، کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد اپنے اَبا سے مل رہی ہیں، اپنی اماں سے مل رہی ہیں، بہن سے مل رہی ہیں، اور اپنے عزیز واقارب سے مل رہی ہیں، اور وہ خوش ہورہے ہیں، تو وہاں تو

خوشی ہی خوشی ہے، اور پھر خاص طور پر جب کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو تو اس کے لیے اور زیادہ خوشی ہے، حدیث میں آتا ہے کہ: ''کہ جب یہاں سے ایک انسان وہاں جاتا ہے تو وہاں روحوں سے ملاقات ہوتی ہے، وہ پوچھتی بھی ہیں کہ فلاں کا کیا حال ہے؟ فلاں کا کیا حال ہے؟''

ابھی ایک مولانا آئے تھے، فرمارہے تھے کہ مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کا ایک شعر ہے (جس کا مفہوم یہ ہے): لوگ کہتے ہیں کہ ''مظہر مرگیا، نہیں بھائی وہ مرا نہیں، وہ تو اپنے گھر گیا'' تو ہمارا اصل گھر تو وہی ہے، یہ تو رستہ کا ایک اسٹاپ ہے، یہ ٹھکانہ ہے تھوڑا، جیسے ایک آدمی سفر کرتا ہے، کہیں ٹھکانہ کیا، پھر آگے چلا، تو دنیا تو ایک ٹھکانہ ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے صبر پر بہت بڑے اجر کی بشارت دی ہے: ''وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صبر کرنے والوں کو بشارت دو، کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو وہ آپے سے باہر نہیں ہوتے، جزع فزع نہیں، بلکہ ان کی زبان سے پہلے ہی نکلتا ہے: ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' ہم بھی اللہ کے لیے ہیں، ہم بھی اللہ کی طرف جانے والے ہیں۔ یہ تو باری کی بات ہے، آج ایک کی باری ہے، کل دوسرے کی، تیسرے کی۔ بعض دفعہ گھر کے کئی لوگ سفر کرتے ہیں، آج ایک روانہ ہو رہا ہے، کل دوسرا، پھر تیسرا، آگے جاکر سب اکٹھے ہوں گے، جب ہم اللہ کے ہیں، جب ہم اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی ملک میں ہیں، اللہ جس کو چاہے یہاں رکھے، جس کو چاہے بلالے، اس پر ہمیں کیا اعتراض ہے؟ گھر باورچی خانے کے اندر، شوکیس کے اندر مختلف چیزیں رکھی ہوتی ہیں، آپ ایک جگہ سے کوئی چیز اٹھا کر وہاں رکھ دیتے ہیں، وہاں سے اٹھا کر یہاں رکھ دیتے ہیں، کوئی اعتراض کرتا ہے؟ میری چیز ہے جہاں رکھوں، تو بھائی! جب ہم اللہ کے بندے ہیں، تو وہ ہمیں یہاں رکھے یا اپنے پاس لے لے تو اس لیے ہمیں اللہ پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

پھر فرمایا کہ: ''أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ'' صلوات اور رحمت اللہ کی طرف سے ہے، اور ''وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''**نعم العدلان ونعم الإداوة**'' کہ وہ جب یہ جانوروں پر اونٹ پر سامان رکھتے تھے تو ایک سامان تو وہ ہوتا تھا جو دائیں بائیں ہوتا تھا، اور ایک کوئی چیزیں بچ جاتی تھیں تو اس کی گٹھڑی بنا کر درمیان میں رکھتے تھے تو اس لیے فرماتے ہیں کہ ''**نعم العدلان**'' یہ عدلان سے مراد ''أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ'' اللہ کی طرف سے صلوات اور رحمت ہے، یہ تو عدلان ہوگیا، اور ''**نعم الإداوة**''، ''وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ''

بہرحال یہ پورا خاندان علمی خاندان ہے، اور مسائل بھی سمجھتے ہیں، اور الحمد للہ انہوں نے نہایت ہی صبر وتحمل سے کام لیا ہے، اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ان کے لیے یہ سارے اجر وثواب ہوں گے۔ جو دنیا سے جاچکے ہیں، جس طرح زندگی میں حقوق ہوتے ہیں، ماں باپ ہیں، بہن بھائی ہیں، عزیز واقارب ہیں، اسی طرح مرنے کے بعد بھی حقوق ہوتے ہیں، ان حقوق میں یہ ہے کہ ان کو

دعاؤں میں یاد کیا جائے، حدیث شریف میں آتا ہے: ’’جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال ختم ہوجاتے ہیں، اعمال کا رجسٹر بند ہوجاتا ہے، اب نماز نہیں پڑھ سکتا تو اجر بھی نہیں ملے گا، روزے نہیں رکھ سکتا تو وہ بھی نہیں ہوگا، زکوٰۃ نہیں دے سکتا، وہ بھی رجسٹر بند ہوگیا، لیکن تین عمل ایسے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کا اجر ملتا رہتا ہے، اور ان میں ’’**ولد صالح یدعو لہ** ‘‘ نیک اولاد جو ان کے لیے دعا کرتی ہے، نیک اولاد، نیک عزیز واقارب، نیک متعلقین جو بھی دعا کرتے ہیں، ان کو ملتا رہتا ہے۔

ہمارے فقہاء میں فقیہ ابواللیثؒ گزرے ہیں، یہ سمرقند میں تھے، اور وہیں ان کی قبر بھی ہے، اللہ نے ہمیں وہاں ایک مرتبہ پہنچا دیا، تو ایک عالم تھے، وہ ہمیں وہاں لے گئے ان کی قبر پر، ہم وہاں چلے گئے، اور فاتحہ پڑھی، ایصال ثواب کیا، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ زندگی میں وہ کہتے تھے کہ یہ ثواب وغیرہ نہیں پہنچتا، ایصال ثواب نہیں پہنچتا، لیکن جب وہ وفات پا گئے تو مرنے کے بعد کسی اللہ کے بندے نے خواب میں دیکھا، پوچھا کہ مفتی صاحب! اب پہنچتا ہے کہ نہیں پہنچتا؟ کہتے ہیں کہ پہنچتا ہے، یعنی زندگی میں تو ان کا یہ فتویٰ تھا، مرنے کے بعد کہتے ہیں کہ پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ آرہا ہے، ان کے شاگرد ہیں، عزیز واقارب ہیں، دعا کررہے ہیں، وہ سب ایصالِ ثواب کررہے ہیں، وہ سارا ان کو پہنچ رہا ہے تو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے اپنے والدین، عزیز واقارب اور ہماری مرحومہ ہیں، ان سب کے لیے ہم دعا کریں گے تو ان شاء اللہ! ان کو ملے گا۔

میں عزیز طلبہ سے یہی گزارش کروں گا کہ جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اسے مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کریں۔ جو حضرات بعد میں آئے ہیں وہ ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ لیں، اس کا ثواب بھی مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کریں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اونچے درجات عطا فرمائیں اور جتنے بھی پسماندگان ہیں، سب کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے، اور دنیا وآخرت میں اس کا اجر وثواب عطا فرمائے۔

عظیم باپ کی عظیم بیٹی کی رحلت

(اہلیہ حضرت مفتی احمد الرحمٰنؒ)

محمد اعجاز مصطفیٰ

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف قدس سرہٗ کی صاحبزادی، امام اہلسنت حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ کی اہلیہ محترمہ، مولانا سید سلیمان یوسف بنوری زید مجدہم کی خواہرزادی، پیر جی صاحبزادہ مولانا عزیز الرحمٰن رحمانی، صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ رحمانی، مولانا حافظ محمد اسامہ رحمانی، مولانا مفتی محمد حذیفہ رحمانی کی والدہ محترمہ ۱۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۱؍فروری ۲۰۱۶ء اس دنیائے رنگ وبو کی چھیاسٹھ بہاریں دیکھ کر راہی عالم آخرت ہوگئیں۔ إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون، إن للّٰہ ما أخذ وله ما أعطی وکل شئ عنده بأجل مسمی۔

مرحومہ عابدہ، زاہدہ، قانعہ، صابرہ اور بہت زیادہ سخی طبیعت کی مالکہ تھیں۔ معمولات کی پابند، ذکر واذکار اور اوراد ووظائف کی خوگر تھیں۔ دلائل الخیرات بلا ناغہ پڑھنے کا معمول تھا۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، اللہ تعالیٰ نے خاندانی طور پر حافظہ بھی غضب کا دیا تھا جو چیز ایک مرتبہ پڑھ لیتی تھیں، اسے بھولتی نہیں تھیں۔ جو پڑھا اس پر پورا پورا عمل کرنے کی خود بھی کوشش کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی احادیث کا حوالہ دے کر عمل کی طرف متوجہ کرتی رہتی تھیں۔

ان کی پیدائش انڈیا کے شہر ڈابھیل صوبہ گجرات میں ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں ہوئی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ان کے کان میں اذان کہی، اور ان کی عمر میں برکت کی دعا کی اور ایک تعویذ بنا کر دیا جو تبرکاً زندگی بھر مرحومہ کے گلے میں رہا۔ آخری ایام میں وہ تعویذ اپنے بیٹے صاحبزادہ محمد طلحہ رحمانی کو دے دیا جو ان کے پاس محفوظ ہے۔ بچپن ٹنڈو الہ یار اور کراچی میں گزرا، دینی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی، تقریباً پندرہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں سے نوازا۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے تھا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرحومہ کو سخاوت کا جذبہ وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا۔ ہر سال کئی کئی قربانیاں کراتی تھیں، جو حضور ﷺ، بزرگان دین، شہید علمائے کرام کی طرف سے ہوتی تھیں، قربانی

کا گوشت جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے طلبائے کرام اور قربانی کے جانور کی کھال عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت بھجواتیں، تاکہ کل قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حاصل ہو۔

جامعہ یوسفیہ بنوریہ بہادرآباد کے مدرسۃ البنات کو انہوں نے ہی سنبھالا تھا، اس کی نگرانی خود کرتیں اور اس خدمت کو ہمیشہ ثواب کی نیت سے اعزازی طور پر انجام دیا، کبھی کوئی مشاہرہ نذرانہ نہیں لیا۔ مدرسہ کی طالبات کے ساتھ خوب شفقت سے پیش آتیں، ان کے ساتھ مالی تعاون کرتیں، ان کی دعوتیں کرتیں، ان کو تحفہ تحائف اور کپڑے دیتیں۔ خاص طور پر ختم بخاری کے موقع پر چادریں اور دوپٹے خود اپنے ہاتھ سے پہناتیں۔

اپنے بچوں اور قریبی رشتہ داروں کے مختلف کاموں کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتیں، حتیٰ کہ ان کی حاجت برآری کے لیے نذریں مانتیں، نوافل اور مالی صدقہ کی نذر مانتیں اور یاد بھی رکھتی تھیں کہ کس کی نذر پوری ہوئی، کس کی باقی ہے؟

مسلکی اعتبار سے بہت پختہ ذہن رکھتی تھیں، عزیز و اقارب کو بھی اس کی ترغیب دیتیں، اور برابر ان کی ذہن سازی کرتی رہتی تھیں۔

کتابوں سے بہت محبت تھی، ان کی حفاظت ونگہداشت کا خاص اہتمام تھا، کوئی اگر کتاب لے جاتا تو بہت ناراض ہوتیں۔ تسبیحات وغیرہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ دلائل الخیرات اور ذکر واذکار کی کتابوں کو خاص طور پر سنبھال کر رکھتیں۔ لباس و پوشاک میں باذوق تھیں۔ مہمان نوازی اور غریبوں کی مدد کرنے پر بہت زیادہ خوش ہوتی تھیں۔ اپنے سید ہونے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتیں اور کبھی جلال میں آکر کہتیں کہ ہم تو سادات ہیں، ہمیں تو شیر بھی نہیں کھاتا۔

نرم طبیعت کی مالک تھیں، رحم دلی کی بنا پر رونا بہت آتا تھا۔ سریع الغضب سریع الفئ کا مصداق تھیں، انتہائی صاف دل تھیں، کوئی بات دل میں نہ رکھتیں، شکوے شکایتیں بھی صرف ظاہری اور وقتی ہوتی تھیں۔

اعزہ، اقرباء یا جاننے والوں میں سے جب کسی کی وفات کا سنتیں تو انتہائی رنج وغم اور افسوس کا اظہار کرتیں۔ جس گھر میں میت ہوتی وہاں خوب اہتمام سے جاتیں، میت کے اہل خانہ کی دلجوئی کے لیے کئی کئی دن ان کے ہاں رہتیں اور اس طرح غم کا اظہار کرتیں جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز فوت ہوا ہو۔ جنازہ جاتے ہوئے دیکھ لیتیں تو اس کے لیے بھی افسردہ ہو جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر روتیں، اور اس کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرتیں، حتیٰ کہ اجنبیوں کے لیے بھی کئی بار قرآن کریم کے ختم کرواتے، پوچھنے پر کہتیں کہ کیا معلوم اس میت کے ساتھ کیا گزرے گی، آخرت کی منزل کیسی ہوگی، ہمیں بھی ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ اخبار میں قتل وغارت گری پڑھ کر غمگین ہوتیں، اور اخبار

میں جن مقتولین کا پڑھتیں ان کے لیے بھی ایصالِ ثواب کرتیں۔شہر و ملک کے امن کے لیے دعائیں کرتیں۔علماء کے انتقال یا شہادت کی خبر سن کر تو انتہائی رنجیدہ ہوتیں اور پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔

چند ہفتے قبل مولانا ہارون الرشیدؒ شیخ الحدیث جامعہ یوسفیہ بنوریہ کا انتقال ہوا، ان کی وفات کی خبر سن کر بہت رنجیدہ ہوئیں، کہا کہ کتنے بڑے عالم تھے، کتنا سال احادیث پڑھائیں اور اسی دن اپنے بیٹوں کو فون کر کے جنازے وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ ان کے لیے ایصالِ ثواب کرو، اور یہ سوچو کہ ہم پر بھی یہ وقت آنا ہے، موت کی سختی سے ہمارا بھی واسطہ پڑنا ہے۔

علماء کرام کا بے حد احترام کرتیں، ان سے دعاؤں کی درخواست کرواتیں، کوئی کسی عالم سے ملنے جاتا تو اس سے دعا کی درخواست کرتیں۔

یادداشت اور حافظہ قوی تھا۔ تمام رشتہ داروں کی تاریخ پیدائش اور دن تک یاد تھے۔ خاندانِ بنوریؒ کے احوال خوب اَز بر تھے۔ خاندان کے افراد ان معاملات کی تحقیق وتصدیق کے لیے اُنہیں سے رجوع کرتے تھے۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ عشق تھا، چالیس سال تک اپنے والد (حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ) اور پچیس سال تک شوہر (مفتی احمد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ) کے لیے بلا ناغہ روزانہ ایصالِ ثواب کرتیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتیں۔

صابرہ، شاکرہ اور حوصلہ مند خاتون تھیں، بیماری کی وجہ سے کبھی پریشان نہ ہوتیں۔شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضہ میں مبتلا تھیں، آخری عمر میں ہیپا ٹائٹس سی بھی لاحق ہوگیا تھا، ایک سال تک علیل رہیں۔ علاج جاری رہا، مگر ہیپا ٹائٹس سی کا مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔

کچھ رقم رکھی ہوئی تھی، اسے کسی کو دینے کی وصیت کی، کچھ رقم کے بارے میں وصیت کی کہ یہ میرے فدیہ میں دے دینا۔ وفات کے وقت سب بیٹوں اور بیٹیوں کو فون کر کے بلایا، اور تقریباً سب سے ہی اس طرح کے جملے کہے کہ میں جا رہی ہوں۔

۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۲ر فروری ۲۰۱۶ء بروز پیر بعد نمازِ ظہر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں استاذ العلماء بقیۃ السلف حضرت اقدس مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی اقتداء میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ بہت بڑا جنازہ ہوا، مسجد اور جامعہ کے احاطہ حتیٰ کہ باہر کی گلیوں میں بھی نمازی موجود تھے۔ تدفین ڈالمیا قبرستان میں ہوئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائیں، ان کی زندگی کی حسنات کو قبول فرمائیں اور انہیں جنت الخلد کا مکین بنائیں۔ بینات کے باتوفیق قارئین سے ان کے لیے ایصالِ ثواب اور دعاؤں کی درخواست ہے۔

مولانا ہارون الرشید ارشدؒ کی رحلت!

۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۱؍فروری ۲۰۱۶ء بروز جمعرات، جامعہ یوسفیہ بنوریہ کے شیخ الحدیث، جامعۃ الراشدات کے بانی، جامع مسجد مکہ گرین ٹاؤن کراچی کے امام وخطیب، استاذ العلماء حضرت مولانا ہارون الرشید ارشدؒ ۷۴؍سال کی عمر گزار کر عالم عقبیٰ کی طرف روانہ ہوگئے۔ **إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہ ما أعطٰی وکل شیٔ عندہٗ بأجل مسمی۔**

حضرت مولانا ہارون الرشید ارشد رحمہ اللہ نے ساری زندگی گوشۂ گمنامی میں گزاردی۔ انتہائی سادہ طبیعت، سادہ مزاج اور تکلف سے کوسوں دور تھے۔ زندگی بھر پڑھنا پڑھانا اپنا مقصد وحید بنائے رکھا۔ شہرت اور ناموری سے کوسوں دور تھے، بڑے اداروں اور جامعات میں بارہا آپ کو دعوتِ تدریس دی گئی، لیکن آپؒ نے اس کو قبول نہ کیا۔

آپؒ کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں کوچہ گاؤں، ڈاک خانہ باشتوالائی ضلع بٹگرام میں محمد طاہر اللہ خان مرحوم کے گھر میں ہوئی۔ والد بچپن میں فوت ہوگئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا حضرت مولانا سالار خانؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم کامل پور ضلع اٹک چلے گئے، وہاں درجہ خاصہ ممتاز نمبروں سے پاس کیا، درجہ عالیہ دارالعلوم قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ میں پڑھا، دورۂ حدیث دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی سے کیا۔ میٹرک آزاد کشمیر بورڈ سے کیا۔ دینی تعلیم کی تحصیل سے فراغت کے بعد ۱۶؍سال تک جامعہ تعلیم الاسلام پلندری آزاد کشمیر میں تدریس کی، اور ۳۰؍سال تک جامعہ یوسفیہ بنوریہ میں پڑھایا اور اس کے ساتھ ساتھ ۱۵؍سال سے جامعہ خاتم النبیینؐ للبنات ماڈل کالونی میں بھی صحیح بخاری کا درس دیا۔ عرصہ ۲۵؍سال سے جامع مسجد مکہ گرین ٹاؤن کراچی میں امامت اور خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے، ''مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی'' کے مصداق حضرت مولانا بالآخر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ آپ کی نماز جنازہ مکہ مسجد میں بعد نمازِ ظہر آپ کے بیٹے مولانا عرفان اللہ فاروقی نے پڑھائی، اس کے بعد بھینس کالونی قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

پسماندگان میں، بیوہ، ایک بیٹا، چار بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ مولاناؒ کی خدمات کو قبول فرمائیں اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔

زیادہ تونگری اور زیادہ تنگدستی برائی طرف کی لے جاتی ہے۔ (بوعلی سینا رحمۃ اللہ علیہ)

خیر محمدؒ کا باوفا صدیقؒ

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز اور باوفا شاگرد، جامعہ خیر المدارس کے شیخ الحدیث، یادگارِ اسلاف، اسوۃ الصلحاء، استاذ العلماء، حضرت مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ ۹۰ رسال کی عمر پاکر ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۸ر فروری بروز جمعرات صبح تقریباً سوا آٹھ بجے خالق حقیقی سے جاملے۔ **إنا للّٰه وإنا إليه راجعون، إن للّٰه ماأخذ ولهٗ ماأعطٰى وكل شيء عندهٗ بأجل مسمّٰى۔**

مولانا محمد صدیق ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کے چک ۲۵۱ گ-ب میں الحاج نبی بخش کے ہاں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی۔ مڈل تک عصری تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم کے لیے جالندھر میں قائم جامعہ خیر المدارس میں داخلہ لیا، تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ملک کے بعد جامعہ خیر المدارس ملتان میں دورہ حدیث تک تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ، مولانا محمد عبداللہ رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نمایاں ہیں۔ دورہ حدیث کی فراغت کے بعد اپنے آپ کو استاذ کے سپرد کردیا اور تاحیات وہ جامعہ خیر المدارس ملتان میں ہی عہد وفا کو نبھاتے رہے۔ آپؒ اپنے اکابر واسلاف کی جملہ حسین ودرخشاں روایات کے امین، علمائے دیوبند کی فکر ومنہج کی سچی تصویر اور تقویٰ وپرہیزگاری کا نمونہ تھے، جس بات کو حق سمجھتے اس پر نہ صرف یہ کہ ڈٹ جاتے، بلکہ اس کا برملا اظہار بھی فرماتے۔

آپؒ نے تقریباً ۷۰ رسال جامعہ خیر المدارس ملتان میں رہ کر علوم نبویہ کی اشاعت وترویج اور درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ چالیس سال تک قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح البخاری کا درس دیا۔

درس وتدریس کے علاوہ فتنوں کا بھی آپ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، خصوصاً ردِ قادیانیت پر آپؒ نے خوب خدمات انجام دیں۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر ومفکر حضرت مولانا محمد علی جالندھری نور اللہ مرقدہٗ نے آپ کو شرفِ دامادی بخشا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو اولاد سے نوازا، ۶ر بیٹے اور تین بیٹیاں جو کہ سب کے سب حافظ قرآن ہیں اور تین عالم دین بنے۔

کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے نکلے ہوئے عمدہ مضامین ماہنامہ ''الخیر'' ملتان اور ماہنامہ ''صدائے فاروقیہ'' شجاع آباد میں چھپتے رہے، خصوصاً قائداعظم کی تقاریر کو

انہوں نے یکجا کیا اور اس کے حوالہ سے آج کے صاحبانِ اقتدار کو آئینہ دکھاتے رہے اور فرماتے کہ پاکستان مسجد کی طرح مقدس ہے، اس میں کسی قسم کا انتشار پھیلانا خود اپنے وجود کو عذاب دینے کے مترادف ہے۔عشق کی حد تک اپنے ملک سے پیار کرتے تھے۔

مولانا اپنی درس بخاری کے افادات اور صحیح بخاری پر کام کررہے تھے، جس کی گیارہ جلدیں مرتب ہوگئی ہیں اور باقی پر کام باقی ہے، اللہ کرے ان کے اَخلاف اس صدقہ جاریہ کی تکمیل کرلیں۔ جمعرات کی رات تقریباً ساڑھے نو بجے آپ کی نمازِ جنازہ قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان اسٹیڈیم میں حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری مرکزی ناظم اعلیٰ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی امامت میں ادا کی گئی۔ شرکائے جنازہ پورے ملک سے وہاں پہنچے۔ راقم الحروف نے بھی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن اور مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔

ادارہ بینات حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے اعزہ، اقربا اور متعلقین سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے، ان کو خلد بریں کا مکین بنائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازے۔ آمین

www.banuri.edu.pk

سؤر کا گوشت پکانا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس بارے میں کہ:
میں آئرلینڈ میں رہتی ہوں اور یہاں ایک کوکنگ کورس (کھانا پکانے کا کورس) کرنا چاہتی ہوں، جبکہ اس میں سؤر کا گوشت بھی پکانا ہوگا اور وہ سب پکانا ہوگا جو آئرش لوگ پسند کرتے ہیں، تو کیا میں سؤر کا گوشت صرف آئرش لوگوں کے لیے پکا سکتی ہوں؟ جبکہ میں خود یہ ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ براہِ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرمادیں۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً

شریعت کی رو سے جو چیز مسلمان کے لیے استعمال کرنا حرام ہو، ایسی حرام چیز کا کسی اور مسلم یا کافر کو بیچنا، کھلانا اور اس کے عوض میں مالی منفعت حاصل کرنا بھی حرام ہے، جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے:

''قال رسول اللّٰه ﷺ: إن اللّٰه إذا حرم شيئًا حرم ثمنهٗ۔'' (رقم الحدیث: ۳۴۸۸)

صحیح البخاری میں ہے:

''عن جابر بن عبد اللّٰه رضي الله عنه: أنه سمع رسول اللّٰه ﷺ يقول عام الفتح وهو بمكة: إن اللّٰه ورسوله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والأصنام، فقيل: يا رسول اللّٰه! أرأيت شحوم الميتة فإنها يطلى بها السفن ويدهن بها الجلود ويستصبح بها الناس؟ فقال: لا، هو حرام، ثم قال رسول اللّٰه ﷺ: عند ذٰلک: قاتل اللّٰهُ اليهودَ، إن اللّٰه لما حرم شحومَها جملوه، باعوه، فاكلوا ثمنه۔'' (رقم الحدیث: ۲۱۲۱، باب بیع المیتۃ والأصنام)

شرح مسلم للنوویؒ میں ہے:

''قال القاضي: تضمن هذا الحديث أن مالايحل أكلهٗ والانتفاع بهٖ لايجوز بيعهٗ

ولایحل أکل ثمنہ، کما فی الشحوم المذکورۃ فی الحدیث۔‘‘ (ج:۱۱،ص:۸)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سائلہ کے لیے صرف آئرلینڈ کے وہ کھانے پکانا یا سیکھنا جائز ہیں، جن میں سؤر کا گوشت و دیگر حرام اجزاء شامل نہ کیے جاتے ہوں۔ نیز سؤر و دیگر حرام اجزاء سے تیار کردہ کھانا بنانا اور غیرمسلموں کو پیش کرنا اور اس پر اجرت لینا سب حرام ہے، لہٰذا اس عمل سے بچنا لازم ہے۔

’’فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ‘‘ میں ہے:

’’لایجوز المتاجرۃ فیما حرم اللّٰہ من الأطعمۃ وغیرھا کالخمور والخنزیر ولو مع الکفرۃ لما ثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم أنہٗ قال: إن اللّٰہ إذا حرم شیئا حرم ثمنہٗ۔‘‘ (ج:۱۳،ص:۴۰)

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد عبدالقادر	سید مزمل حسن

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

www.banuri.edu.pk

www.banuri.edu.pk

www.banuri.edu.pk